مجاز نمبر
شاہراہ

اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے!
(مجاز)

ادارہ
فکر تونسوی ۔ محمد یوسف جامی

مارچ ۱۹۵۶ء
جلد ۸ نمبر ۳
زرِ سالانہ: چھ روپے
عام نمبر: نو آنے
قیمت مجاز نمبر
ایک روپیہ

پبلشر: منشی عبدالقدیر ۔ جدید برقی پریس ۔ دفتر اردو بازار دہلی

اب کی بار

اس انجمن گل میں — ایڈیٹر — ۳
باتیں — فراق گورکھپوری — ۵

تاثرات :-

ایک شعلۂ غم — جوش ملیح آبادی — ۷
بڑا شاعر، معصوم ہستی — مجنوں گورکھپوری — ۹
یاروں کے خطوط — سبط حسن
سلام مچھلی شہری
ہنس راج رہبر
واجدہ تبسم — ۱۱
جگن بھیا — حمیدہ سالم — ۱۵

اپنے قلم سے :- (مجاز مرحوم کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں)

(۱) بول اری او دھرتی بول
(۲) فضل کی شاعری (عکسی تحریر)
(۳) دو نظمیں (غیر مطبوعہ)
(۴) کیسی تباہی آئی (عکسی تحریر)
(۵) دو گیت — (غیر مطبوعہ) ۲۵

پانچ نظمیں :-

نریش کمار شاد — ۳۳
خطا کس کی ہے — سلام مچھلی شہری — ۳۴
مجاز کی یاد میں — نیاز حیدر — ۳۶
آج پھر اک خبر — زبیر رضوی — ۳۷
مجاز کا عالم جنوں — دانش فرازی — ۳۸

تنقیدات :-

کیا جنوں کر گیا	ممتاز حسین	۳۹
موت اور تخلیقی عمل	ڈیوڈ ایسٹر	۴۲
مجاز کی ایک نظم	فکر تونسوی	۴۵
انقلاب کا مطرب	فیض احمد فیض	۵۱
مجاز کی شاعری	فیض الرحمان اعظمی	۵۴
انتظاریہ :- اونچی آواز کی سوچ بچار	ظ۔ انصاری	۵۷
ماتمِ یک شہرِ آرزو :-	(ساتھی شعراء کی نظمیں)	۶۲
یادیں :-		
جوانی کو کفن	احتشام حسین	۶۷
مطربِ بزمِ دلبراں	وقار عظیم	۷۰
عشقِ مجازی	عصمت چغتائی	۷۳
اسرار الحق مجاز	اطہر پرویز	۷۷
میرا دوست میرا مہمان	جاں نثار اختر	۸۳
مجاز چچا	سعید اختر نعمانی	۸۷
مجاز کچھ اور بھی تھا	حسن نعیم	۹۱
ہمارا خیال ہے :-	(ہمارا ایک مستقل عنوان)	۹۲
ریویو :- ساحر لدھیانوی کی پرچھائیاں	(ادارہ)	۹۵
اشتہارات	مشتہرین	۹۷

تاریخِ وفات

مرنا ہی تھا غریب کو لیکن نہ اس طرح
کیسے کہوں شباب نے مارا مجاز کو
اقرار کیا کریں گے رقیبانِ باطنی
کہہ دیں گے بس شراب نے مارا مجاز کو
انکار۔ سے تو ملتی ہے تاریخِ واقعہ
۲۷۳
احباب اور شراب نے مارا مجاز کو
۲۷۳ × ۱۱۰۳ = ۱۳۷۵ھ

(حکیم میرن دہلوی)

اداریہ

اِس انجمن گُل میں

مجاز نمبر کے مضامین تین قسم کی کیفیتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایک کیفیت وہ ہے جس میں یادوں کی رومانٹک مگر جذبات انگیز رقت کارفرما ہے۔ دوسری کیفیت میں مجاز کی شاعرانہ تخلیقات میں شناوری کی گئی ہے۔ اور تیسری کیفیت جو بیک وقت روایتی بھی ہے اور منفرد بھی۔ ان اسباب کی جستجو کرتی ہے جس میں مجاز کی موت ہوئی۔

دراصل ہوتا یوں ہے کہ اپنے کسی محبوب فنکار کی موت سے جو ایک فوری جھٹکا سا لگتا ہے وہ ہمارے اظہار کو یکدم گنگ کر دیتا ہے ہمارے تاسف میں ایک بے بس قسم کی عقیدت شامل ہو جاتی ہے اور پھر رسمی؛ اخلاق کی گرفت تو ذہن کو اور بھی سُن کر دیتی ہے۔ مجاز کے معاملے میں تو حالات اس لئے بھی دگرگوں ہو گئی کہ وہ شخصیت اور فن دونوں اعتبار سے ہم سب کی خوبصورت امید کی علامت تھا۔ خیر فن اور شخصیت تک تو ہم جذباتیت سے بھی کام نکال لیتے لیکن وہ جو موت کے اسباب کا معاملہ تھا اس نے ہمیں نہایت برافروختہ کر دیا۔ یہ برافروختگی اس لئے بھی فطری اور جائز تھی کہ ابھی ابھی چند ماہ پہلے ہم غنٹو کا چرکہ کھائے بیٹھے تھے۔

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مجاز کی موت پر ہمارے فنکار یکایک چونکتے ہو گئے ہیں۔ ہمیں یکدم اصلاح اور پند و نصائح کا دامن پکڑنا پڑا ہے اور مسئلہ کو منطقی نتائج کی امداد سے حل کرنے کی تیز تیز کوشش کر رہا ہے۔ اسی تیزی کا اثر ان مضامین پر بھی پڑا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ جن میں مجاز کے فنی تارو پود پر۔ توازن سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مجاز کے فن اور شخصیت پر ابھی کتنی ہی اور تحریریں لکھنے کا سوال ذہنوں میں برابر اٹھ رہا ہے کئی ادیب ساتھیوں نے تو صاف صاف اعتراف کر لیا کہ ابھی ان سے قلم اٹھ نہیں سکتا۔ انتظار اس کا ہے کہ جب قلم اٹھیں گے تو کیا لیپٹی سے اس وقت بھی دامن بچا سکیں گے یا نہیں۔ اور وہ موت کے اسباب کی جستجو تو نہایت غیر ادبی اٹھتم ہے اور یہی سب سے زیادہ جذباتیت بھی ہوئی ہے ——— مجاز کی کسی عظمت کا اعتراف کرانے کے لئے سنبھالے کی اشد ضرورت ہے ورنہ فوری پریشانی سے تو صرف تسکین عقیدت ہی حاصل ہونے کا خدشہ ہے اور کچھ نہیں۔

اس نمبر میں ایک مضمون پر میں بالخصوص توجہ لاؤں گا۔ یہ ہے مجاز مرحوم کی بہن حمیدہ سالم کا مضمون "جگن بھیا"۔ حمیدہ ادیبہ نہیں ہیں لیکن ان کے جگن بھیا کی موت اتنا عظیم حادثہ تھا کہ ان کا قلم بھی ادبی حسیات میں ڈوب گیا۔ اس میں جو منفرد چیز ہماری توجہ کھینچتی ہے وہ ہے مجاز کے ذہنی نشوونما کا ابتدائی نقوش، جو آگے چل کر مجاز کی فنی اور شخصی تعمیر کی بنیاد بنتی ہیں اور پھر اس پس منظر کے بعد ہمارے لئے کسی حد تک یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ آغاز انجام کی کڑیاں کس ساخت کی ہیں۔ کسی بھی فن کار کے فن پر تنقید کرتے ہوئے اس کی یہ کرداری کڑیاں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ حمیدہ نے کبھی جذبات میں ڈوب کر اور کبھی جذبات سے بلند ہو کر یہ کڑیاں　ان نقادوں کے لئے مہیا کی ہیں جو شاید مجاز پر لکھتے وقت چند فارمولوں سے کام چلا لیتے۔ اس دین پر ہم سب حمیدہ کے ممنون ہیں۔

معذرت: — ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ باقر مہدی صاحب کا ایک طویل اور جامع مقالہ اس نمبر میں شامل نہیں ہے۔ اس مقالہ کا اصل مسودہ ایک غیر اتفاقی حادثہ کی وجہ سے کھو گیا اور ہمارے قارئین ایک اہم مضمون سے محروم رہ گئے۔

فکر تونسوی

فراق گورکھپوری

باتیں

باتیں اس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

آج مجاز کی باتیں کروں گا۔ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا۔ کوئی ہفتہ وار اخبار جس کا نام غالباً ہندوستان تھا۔ لکھنؤ سے میرے نام آنے لگا تھا۔ اس اخبار میں ایک نظم میری نظر سے گزری۔ اس زمانہ میں ایسی نظمیں بہت کم دیکھنے میں آتی تھیں۔ مصرعے دریا کی طرح جوش مارتے بڑھ رہے تھے۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی گھر گھراہٹ چیرتی پھاڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ نظم تھی مجاز کی جن کا نام میں نے اس وقت تک نہیں سنا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک نئی آواز نے اردو میں جنم لیا ہے۔ ابھی اس نظم کا اثر دھیما نہیں پڑا تھا کہ اسی پرچے میں کچھ ہفتوں بعد مجاز کی دوسری نظم اندھیری رات کا مسافر نظر آئی۔ یہ نظم اور بھی زلزلہ خیز تھی۔ دونوں نظمیں جمود شکن تھیں۔ یہ نظمیں ترقی پسند شاعری کے اعلان نامے (manifesto) کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ آواز اقبال، جوش، اختر شیرانی یا اردو شاعری کے دوسرے مشاہیر کی آوازوں کی صدائے بازگشت نہیں تھی۔ آسمانِ شاعری پر ایک نئے ستارے کے رقص کا سرگم اس نئی آواز میں سنائی دے رہا تھا۔ یہ آواز سن کر ہزارہا لوگوں کے جسموں میں دل کی دھڑکن اور خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ اجتماعی زندگی کا (Tempo) بڑھ جاتا تھا۔ یہ آواز قومی زندگی کی تقدیر کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ وہ تقدیر جو یکایک جاگ اٹھی تھی۔ دونوں نظمیں جشنِ نشاطِ ثانیہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دونوں نظموں میں رات ایک نئی صبح کا پس منظر بن جاتی تھی۔ مصرعوں سے پوئیں پھوٹتی تھیں۔ شعلے لپکتے تھے۔

اس کے کچھ ہفتوں بعد اس اخبار میں مجاز کی تیسری نظم "آوارہ" شائع ہوئی۔ فنی و وجدانی لحاظ سے یہ نظم اور بھی نکھری ہوئی تھی۔ اس تیور کی نظم اس سے پہلے شاید ہی دیکھنے میں آئی ہوگی۔ پھر اس نظم نے دوہرا اثر ڈالا۔ ایک اثر تو وہی جسے ابھی ابھی میں نے بیان کر دیا ہے۔ دوسرا اثر نیم شعوری یا تحت الشعوری تھا۔ وہ یہ کہ شاعر کے ایک خطرناک انتشار کی طرف یہ نظم اشارہ کر رہی ہے۔ پہلی دونوں نظمیں اثباتی قوتوں اور قدروں سے مالا مال تھیں۔ یہ نظم منفی یا معکوس قوتوں اور قدروں کی حامل تھی۔ یہ نظم شاعر کی زندگی کے آخری چھ سات سال اور اس کے المناک خاتمے کی پیش گوئی تھی۔ یہ نظم بارود پر چنگاری کے منڈلانے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نظم کی نوک پلک نظر فریب بھی تھی اور اعلانِ خطرہ بھی کر رہی تھی۔ ایک سوئے ہوئے جوالا مکھی کے عنقریب پھٹ جانے کی گڑگڑاہٹیں اس نظم میں سنائی دیتی تھیں۔ نظم میں ایک خطرناک دلکشی تھی۔ اس میں مقناطیسی کشش تھی۔ پہلی دونوں نظموں میں صحت مند خارجیت و داخلیت تھی۔ اس تیسری نظم میں ایک تپ زدہ شاعر کو توڑ کر رکھ دینے والی لرزہ خیز داخلیت تھی مگر نظم کے سحر ساحری سے انکار ناممکن تھا۔ انحطاط کے چہرے پر تپ دق کی جھلکتی ہوئی سرخی ہوتی ہے۔ یہ نظم مجاز کے اندر چھپی ہوئی اس آگ کا پتہ دیتی تھی جو شاعر کو ایک دن پھونک کے رکھ دے گی۔ اس نظم سے متعلق میں اتنی باتیں ایک سانس میں کہہ گیا۔ لیکن یہ اثرات ایک سانس میں نہیں پڑے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ اس نظم میں جو بار بار یاد آنے کی صفت (haunting quality) تھی اس کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ میرے ذہن میں اس نظم کے متعلق یہ تاثرات مرتب ہوتے رہے۔

یہ سچ ہے کہ یہ بھیڑیوں کی دنیا اس قابل نہیں کہ شاعر یہاں زندگی بسر کرے۔ یہ سود و زیاں کے گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے، ایک دوسرے کا خون پینے اور ایک دوسرے کا گوشت کھانے والے درندے اس قابل نہیں کہ ان کی لاشوں سے اٹی ہوئی زمین پر شاعر چلے اور پھرے اور اس منحوس و ناپاک سیاسی اصطبل میں شاعر قدم رکھے، جہاں گدھوں کی گردنوں میں زرّیں طوق جگمگا رہے ہیں۔ اور یہی ایک ایسی بات ہے جس پر نگاہ کرکے میں اے مجاز تجھے مبارکباد دیتا ہوں کہ تو اِس دنیا سے چلا گیا۔ اور عین جوانی کے موسمِ بہار میں چلا گیا۔

لیکن تیری یہ جواں مرگی اور جواں بختی میرے واسطے ایک ایسا شعلۂ غم چھوڑ گئی ہے۔ جو میرے سینے کے اندر اس وقت تک جلتا رہے گا جب تک کہ سانس چلتی رہے گی۔

ایک تیرے سدھار جانے سے میرے دل کی نگری اس طرح اُجڑ کر رہ گئی ہے کہ اب دوبارہ آباد نہیں ہو سکے گی۔

مجاز اب میرا بھی چل چلاؤ ہے، تیری موت کے قلق نے مجھے یہ بات بتا دی ہے کہ زیادہ جینا بہت بڑی بے غیرتی، اور اپنے فن کی سب سے بڑی توہین ہے۔

میری رات بھیگ چکی ہے، تارے سر پر ٹمٹما رہے ہیں، بستر تہ کر لیا گیا ہے، کمر باندھ لی گئی ہے۔ اور اب یہ مسافر بھی تیار ہو چکا ہے۔ مجاز گھبرانا نہیں، جوشؔ بھی آ رہا ہے، جلد آ رہا ہے، گھبرانا نہیں اے مجاز۔!!

•

مکرمی!

غم کی انتہائی شدّت میں نہ تو نظم ہی کہی اور نہ نثر ہی لکھی جا سکتی ہے، اور یہ جو کچھ لکھا گیا ہے، محض ایک کراہ ہے — چاہئے تو اسے شائع کر دیجئے، دل کی دھڑکن اور اعصاب کی کپ کپاہٹ کی بنا پر ہات جما کر لکھا نہیں جا رہا ہے، جس سے حروف کی شکلیں مسخ ہوتی چلی جا رہی ہیں، اس وقت عبارت کا ربط ناممکن ہے۔

جوش

مجنوں گورکھپوری

بڑا شاعر، معصوم ہستی

۶ر دسمبر ۱۹۵۵ء - گیارہ بجے رات :-

ابھی کل رات مجھے سجاد ظہیر کا تار ملا کہ پانچ چھ شعراء ۶ر دسمبر کو ایکسپریس یا میل سے میرے کالج کے مشاعرے میں شرکت کے لئے آ رہے ہیں جن میں مجاز بھی ہیں۔ اور آج ہی یعنی ۶ر دسمبر کو علی الصباح مجھے سجاد ظہیر ہی کا تار ملا کہ مجاز کا انتقال ہوگیا۔ مجھے اس خبر سے جو صدمہ ہوا اس کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو شیون و واویلا اور ظاہری تعزیت یا پرسا دینے کو بڑی اصلی یا اہم بات سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ میں خود پابندِ بستر ہوں اور اُردو کنونشن میں نہ شریک ہو سکا۔ مگر میں آج دن بھر ایک لمحے کے لئے آرام نہ کر سکا اور سب سے زیادہ غصہ مجھے اس بات پر ہے کہ کاش میں اپنے کو کھینچ کر کسی طرح لکھنؤ پہنچا دیتا تاکہ مجاز کو آخری بار دیکھنا مجھے نصیب ہو جاتا۔ اور یہ قلق میرے دل سے جانے والا نہیں ہے۔ مگر اب سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ کہ دعا کروں کہ ان کے پس ماندگان کو صبر، تحمل نصیب ہو کہ ایسا شدید اور جانکاہ غم برداشت کر لیجائیں اور آئندہ مجاز کی یاد دعائے نیک کے ساتھ کر سکیں۔

مجاز کی ناگہانی موت کے مفصل حالات مجھے ان لوگوں سے معلوم ہوئے جو اردو کنونشن میں شریک ہونے گئے تھے۔ اور آج یعنی ۶ر دسمبر کی شام کو گورکھپور لوٹے۔ میں اس وقت اس ذہنی عالم میں نہیں ہوں کہ اس پر کچھ کہوں۔ اور پھر یوں بھی مرنے والے کی شان میں سوائے کلمۂ خیر کے کوئی دوسرا لفظ منہ سے نکالنا یا اس پر اشارتاً کنایتاً کوئی رائے زنی کرنا تو بدنیتی کی دلیل ہوتی یا چھوٹے پن کی۔ میں عنقریب مجاز پر ایک مضمون لکھوں گا۔ اس وقت میں اچھی طرح واضح کروں گا کہ میں اُردو شاعری کی دُنیا میں اور نئی نسل کے اُردو شاعروں کے گروہ میں ان کو کیا سمجھتا ہوں۔ یہ چند سطریں محض رسمی تعزیت کے طور پر نہیں بلکہ اس اُداسی کا اظہار کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں جو مجاز کی اچانک موت کی خبر سُنتے ہی مجھ پر چھا گئی۔ لیکن دو چار باتیں اس سلسلے میں کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

مجاز اپنے مختصر مجموعۂ کلام کے باوجود نئی نسل کے اکثر مشہور شاعروں سے کئی اعتبار سے بہت بڑا اور بلند شاعر تھا۔ وہ ان شاعروں میں سے تھا جن کے کلام کو پسند یا ناپسند کرنا مذاقِ شعری کا اصلی امتحان ہوتا ہے۔ جو لوگ مجاز کے کلام کو پسند نہیں کرتے (اور ایسے لوگوں کی تعداد شاید ایک دو ہی ہو جو یہ کہہ سکیں کہ وہ مجاز کے کلام کو پسند نہیں کرتے) وہ یقیناً رچے ہوئے ذوقِ شاعری کی میزان پر پورے نہیں اُتریں گے۔ مجاز کی شاعری اس پایہ کی کیوں تھی اس پر وضاحت

ساتھ تبصرہ پھر کبھی کروں گا۔ لیکن میں مجاز کی ذات اور ان کی شاعری کو ۱۹۳۵ء سے اچھی طرح جانے پہچانے ہوئے ہوں۔ اس شخص نے ۱۹۳۶ء میں اپنی شاعری کی ایک ایسی ساکھ قائم کرلی تھی جو اس کے ہم عمر شاعروں کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی نسل کے بیشتر شعرا اس وقت محض ریز گررہے تھے۔ مجاز کی اس بلندی کا راز کیا ہے؟ مختصر طور پر فی الحال اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی شاعری میں روایاتِ قدیم کا بہترین زندہ ترکہ موجود ہے۔ اور اُسی کے ساتھ نئی زندگی کی نبض کی دھڑکنیں بھی واضح طور پر محسوس ہوتی ہیں اور یہ اجزا اس کی شاعری میں اس طرح ایک مزاج بنے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے پھر الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مجاز کی شاعری بڑی تربیت یافتہ اور مہذب ہے لیکن اس میں کہیں سے اکتساب یا کتابی مطالعہ کی مہک نہیں ملتی۔ اس کے اشعار میں جو وزن اور وقار اور شائستگی اس ہمواری کے ساتھ ملتی ہے۔ وہ ہمیں اس کے دور کے کسی دوسرے اُردو شاعر میں نہیں ملتی یہ شائستگی اس کی شاعری اور شخصیت دونوں کے ضمیر میں موجود ہے۔ اور یہ اس بیباکی کی علامت جو ہمیں انگریزی کے شاعر شیلی یا جرمنی کے مشہور شاعر ہنرچ ہائنہ (Henrich Hane) میں ملتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اور اعتبارات سے بھی مجاز اور ان مغربی شاعروں کے درمیان کوئی خاص قرابت تھی۔ میں اپنے خیالات کو شرح و بسط کے ساتھ پھر پیش کروں گا۔ اس وقت مجاز کے کلام کے مجموعے میرے سامنے نہیں ہیں۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اگر وہ صرف نظم "آوارہ" اور وہ غزل کہہ کر مرجاتا جس کے دو شعر اس وقت مجھے یاد آرہے ہیں:-

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے،
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں،
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

تو بھی اس کا نام اُردو شاعری میں زندہ رہتا۔ کئی سال ہوئے مجاز نے گورکھپور ہی میں مجھے یہ دو اشعار سُنائے تھے اور کہا تھا کہ مجنوں صاحب ابھی غزل پوری نہیں ہوئی ہے۔ معلوم نہیں یہ غزل پوری ہوسکی یا نہیں۔ مگر صرف یہ دو شعر پوری غزل اور نہایت رچی ہوئی غزل کا حکم رکھتے ہیں۔

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا!

یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں
میں نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا!

لیکن مجاز بہت بڑا شاعر ہی نہیں تھا۔ اس کی جگہ میرے دل میں ہمیشہ اس وجہ سے رہے گی کہ وہ اپنی خستہ و رنجور حالت کے باوجود نہایت پاک باطن، خوش اعتقاد، نیک نیت اور شریف النفس انسان تھا۔ میری عمر اسی میں گزری ہے اور مجھے اس کے بہت موقع ملے ہیں کہ میں انسان کو وہ شاعر ہو کہ غیر شاعر پرکھوں، اور میں یہ برابر کرتا رہا ہوں۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ مجاز سے زیادہ حلیم اور شریف ہستی اس کی نسل میں مجھے کوئی نہیں ملی۔ مجاز کی موت ایک بہت بڑے شاعر اور ایک نہایت معصوم ہستی کی موت ہے۔

یاروں کے خطوط

مجاز یاروں کی محفل سے اُٹھ گئے۔ تو یاروں کے ذہن میں یادوں کے چراغ روشن ہو اُٹھے ہم عصر فن کاروں کے ساتھ مجاز کی کتنی ہی حسین اور دلآویز یادیں وابستہ ہیں۔ کس کڑے حالات میں ان یادوں کے تار و پود بنے۔ ہم عصر ادیبوں کے یہ چند خطوط ـــ بہت سے خطوط میں سے یہ چند خطوط مجاز کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں ـــ

شہر نگار کا شاعر

پیارے نگر! تمہارے دونوں خط ملے۔ تم نے مجاز پر مضمون مانگا ہے۔ لکھنؤ سے بھی دو تین خط آئے ہیں جن میں مجاز پر مضمون کی فرمائش کی گئی ہے۔ مجاز کو مارنے کے بعد اب تم لوگ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی فکر میں ہو۔ جی چاہتا ہے اُن سب لوگوں کو گالیاں دوں جو مجاز کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اور اس کے فن کی پرستش کرتے تھے (میں خود بھی ان میں شامل ہوں) لیکن جنہوں نے کبھی مجاز کے غموں کا مداوا نہ کیا۔ چارہ سازی اور غمگساری کی بجائے ہمیشہ نصیحتیں کرتے رہے۔ مجھے اُن خواتین سے بھی کچھ کہنا ہے جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مجاز کا کلام سنا کرتی تھیں۔ اسکی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی تو اُن کی لذت شیریں خطرناک صورت اختیار کرلیتی تھیں اور جب حسن و جمال کا شیدائی اُن کی ساڑی کا پلو چھونے کی کوشش کرتا تو وہ ایک حقارت آمیز قہقہہ لگا کر اپنی خوابگاہ میں چلی جاتیں اور شاعر کو تڑپتا چھوڑ جاتیں۔ مجھے اُن خواتین سے یہ شکایت نہیں کہ انہوں نے مجاز سے محبت کیوں نہیں کی۔ محبت نہ کرنے کا اُنہیں اتنا ہی حق تھا جتنا مجاز کو محبت کرنے کا۔ مجھے تو اُن سے صرف یہ شکایت ہے کہ وہ مجاز کی طبیعت سے آگاہ ہونے کے باوجود اُس کے ذہن کے پاکیزہ اور معصوم جذبات سے کھیلتی کیوں تھیں۔ اگر مرد کو عورت کے ساتھ کھیلنے کا حق نہیں تو عورت کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ کسی مرد کو اپنی تفریح اور وقت گزاری کے لئے استعمال کرے۔ مجاز کو دہلی بہت پسند تھی۔ تم تو جانتے ہو گے اسکی کئی نظمیں اور غزلیں دہلی سے وابستہ ہیں۔ اور دہلی ہی میں کہی گئی تھیں۔ آوارہ کے بارے میں ایک دن بات چلی۔ شام کا وقت تھا۔ مجاز اور میں جامع مسجد سے دریا گنج جا رہے تھے۔ راستے میں ایک سینما گھر پڑتا تھا۔ اس کا نام نشاط تھا۔ مجاز کہنے لگے۔ آوارہ کے کئی بند میں نے یہیں نشاط کے سامنے پارک میں بیٹھ کر لکھے تھے۔ وہ جو میں نے لکھا ہے کہ "اِک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب" تو وہ محل یہی نشاط گیز تھا اور چاند اسی کی آڑ سے نکل رہا تھا۔ خواب سحر بھی دہلی کی تخلیق ہے مجاز نیا ادب کے کام سے دہلی گئے تھے اور وہیں سے انہوں نے یہ نظم ہمیں لکھنؤ بھیجی تھی۔ نیا ادب کے لئے۔ دہلی کو وہ شہر نگار کہا کرتا تھا۔ یاد ہے تمہیں یہ نظم ؎ میرا شجہ آ ہی گیا میرا تمنادار آ ہی گیا ـــ کیسی گنگناتی کھنکتی مہکاتی نظم ہے یہ۔ مجھے تو اُس کی اکثر غزلوں اور نظموں کی شان نزول معلوم ہے۔ ۲۲ سال سے وہ میرا دوست تھا مگر بھائی ابھی میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکتا۔ ذرا یہ نالہ و شیون ٹھہرے تو کچھ لکھوں۔ تم شاہراہ کا مجاز نمبر نکال رہے ہو۔ ضرور نکالو ممکن ہوا تو میں بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤں گا۔

تمہارا ـــ سبط حسن

لیکن میں مجاز کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں۔

تمہارا —— سلام مچھلی شہری

مزدوروں کا شاعر

فکر بھائی!

بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ لوگ شاہراہ کا مجاز نمبر نکال رہے ہیں۔ مجاز اس بات کا مستحق تھا۔ اسکی یاد آتے ہی بہت سی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ مجاز نے ۱۹۳۰ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اور ۱۹۳۵-۳۶ء میں اسکی شاعری اپنے جوبن پر تھی۔ یہ جوبن کا دور ۱۹۴۹-۵۰ء میں جیسے ایک دم ختم ہو گیا۔ اسکی شاعری میں نوجوانی کا جو ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے وہ اس عہد کے دوسرے شاعروں میں بہت کم ہے دوسری بات جو مجاز کو اپنے ہمعصر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کا مزدور یعنی محنت کش طبقہ کی طاقت میں اٹل وشواس ہے۔ مجاز نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مزدور کے تاریخی رول کو سمجھ لیا تھا اور وہ اسے ہمارے اس دور کے انقلاب کا رہنما سمجھتا تھا۔ یہ اس کے گیت "مزدور ہیں ہم مزدور ہیں" سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس بات کو سمجھنے کی فکر میں تھا کہ مجاز جو لکھنؤ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا اور جس نے علیگڑھ یونیورسٹی کے ماحول میں تعلیم حاصل کی۔ اس نے محنت کش طبقہ کے اس رول کو کیسے سمجھا۔

دلی سے جب شاہراہ نکلا تو ۱۹۴۸-۴۹ء میں مجاز ساحر لدھیانوی کے ساتھ دلی میں رہے۔ میں بھی تقسیم کے بعد سے لاہور چھوڑ کر دلی میں رہنے پر مجبور ہوا تھا۔ ان دنوں مجاز سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مجاز خاموش فطرت اور کم سخن آدمی تھا۔ کبھی کوئی لطیفہ تو لطیفے ہی کہہ دے۔ مگر شعر و شاعری سے متعلق سنجیدہ بات چیت کم کرتا تھا۔ مگر ایک دن جب وہ موڈ میں تھا میں نے پوچھا "مجاز بھائی! یہ بتایئے کہ مزدور کے تاریخی رول میں آپ کا یہ اعتقاد کیسے پیدا ہوا۔"

"۱۹۳۶-۳۸ء کا ہنگامی دور تھا۔" اس نے کہا۔ "سوامی سہجانند مجھے نظم پڑھنے کے لئے کسان سبھا کے جلسوں میں بلایا کرتے تھے۔ اور میں بارہا کانپور ٹریڈ یونین کے زیر اہتمام ہونے والے مزدوروں کے جلسوں میں بھی جاتا تھا۔ یوں مجھے کسانوں مزدوروں کے بھاری مجمعوں کو خطاب کرنے کا انہیں نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان دونوں کے جوش کا اندازہ کرو اور پھر دیکھو کہ کتنے آدمی ان جلسوں میں آتے تھے بات سمجھ میں آگئی دراصل عوام ہی وہ قوت ہیں جو شعر اور ادب کو جاودان بناتے ہیں۔"

ایک دن پھر مجاز نے ایسے ہی موڈ میں کہنا شروع کیا۔

"اردو شاعری میں ایک مدت تک غالب کا بت پجتا رہا۔ پھر اقبال کے بت کی پوجا ہونے لگی۔ اور اب تک ہو رہی ہے۔ یہ بت پرستی نہایت خطرناک ہے۔ اس سے کئی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اب بت پرستی کا زمانہ نہیں رہا۔ اب تو وہی شاعر زندہ رہے گا جس کی اپنی نظر بھی اور اپنا ایک انداز بیان بھی پیدا ہو گیا تھا جس میں شاعر کا انتہائی خلوص شامل تھا۔ "ننھی پجارن" "خواب سحر" "نہاں" اور "بول ری دھرتی بول" اسکی بہت پیاری نظمیں ہیں۔ اسکی نظر کو ابھی اور تابناک ہونا اور انداز بیان کو اور سنورنا تھا۔ لیکن وہ وقت سے پہلے ہی غلط ماحول اور غلط رجحانات کا شکار ہو گیا۔ زندگی کے آخری دور میں اسے دیکھ کر گمراہ اور بھٹکی ہوئی عظمت کا خیال آتا تھا جو اپنے خلوص اور بے ریائی کے باعث ہر حالت میں قابل احترام تھی۔ مجاز اپنی بربادیوں سے آگاہ تھا اور زندگی ہی میں زندگی کا ماتم کر چکا تھا۔

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ہنسراج رہبر

نادان بالک

فکر صاحب!

مجاز نمبر کے لئے میں کیا لکھوں۔ مجاز نے مجھے کبھی پرسنل ٹچ نہیں رہا۔ عام طور سے لوگ جب کسی ایک کے بارے میں اپنے احساسات اور تاثرات کو قلمبند کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی بات بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ یہ بات میں نے آج سے دو تین ماہ پیشتر سوچی تھی جب اختر بھائی (جان نثار اختر) اردو کانفرنس کے سلسلے میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ اختر بھائی آتے اور گھنٹوں ہم دونوں باتیں کرتے رہتے۔ باتوں باتوں میں اختر مجاز کا

بھی فکر آ جاتا۔ اس کے فن شاعری کا — اس کے شرابی ہونے
کا۔ ان کے لطیفوں کا — میں مسکرا دیتی اور خاموش ہو جاتی۔ میں نہیں
سمجھ سکی میرا اس کو کن زنجیروں نے باندھ رکھا تھا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ
اختر بھائی نے ایک بار کہا تھا — اب تو مجاز کی ساری شاعری شراب
کی نذر ہو گئی ہے — میں سوچتی ایک اتنا اچھا اور عظیم شاعر کس طرح
برباد ہو رہا ہے۔ کیا کوئی ایسی روک نہیں کی جا سکتی کہ یہ سنبھل جائے
زمانے کو اس کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ خود یہ نہیں جانتا۔ شراب نے
اسے بری طرح گمراہ کر دیا ہے کہ دنیا و مافیہا کے ساتھ ساتھ خود کو بھی
بھول بیٹھا ہے۔ شراب نے اسے پاگل خانہ بھی تو پہنچا دیا تھا — ایسا
نہ ہو کہ یہی شراب اسے آگے جہاں بھی پہنچا دے۔"

اکثر میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ مجاز کو خط کیوں نہ لکھوں۔
مگر میں نے یہ بھی سوچا کہ بھلا مجاز پر میرے خط کا کیا اثر ہوگا — ہو سکتا ہے
وہ شراب کے نشے میں میرا خط پڑھے ہی نہیں۔ پھر بھی میں نے سوچا۔
ایسا کر لینے میں برائی ہی کیا ہے — عورت کی عظمت تو مشہور ہے۔
میں اسے سمجھاؤں گی۔ سمجھاؤں گی۔ اس کے دل پر ممتا سے ہاتھ رکھ دوں
گی تو کیا ہو نہیں سکتا کہ اس کا دل مچل اٹھے۔ یہ انسان تو ہے جو برائیاں
کرتا ہے۔ گناہ کرتا ہے اور یہ انسان ہی ہے جو اپنی برائیوں پر نادم ہو
کر اپنے گناہ پر شرمسار ہو کر سر جھکا لیتا ہے۔" میں انسان سے مایوس
نہیں ہوں اور اسی ناطے مجاز سے بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے — میں
عورت کی عظمت کی بڑی طرح قائل ہوں۔ اس کے آنسو۔ اس کی
مسکراہٹ — اس کی ضد — اس کا پیار۔ اس کی نفرت — یہ سب چیزیں
اس طرح سے مشابہ ہیں جیسے کوئی کاٹ ہی نہیں — وہ خود سے
محبت کرنے سے۔ آنسوؤں میں تقدیر پر سہا لینے سے تو بات نہیں بنتی۔
پھر یہ عورت — یہ حوا جو اتنی عظیم ہے — اتنی ضد کا ہے کہ آدم
کو جنت تک سے نکلوا سکتی ہے۔ وہ مجاز کو میخانے سے بھی کیوں نہیں
کھینچ سکتی۔ اور اس دن واقعی مجھے ان سب لڑکیوں پر بے حد غصہ آیا
تھا۔ جو صرف مجاز کی چاہت کرتی تھیں۔ ان سب میں سے کسی نے
مجاز کو نہیں چاہا۔

اور میں نے سوچا کہ مجاز کو خط لکھوں گی۔ مجاز کو پند و خط
لکھوں گی — ایسا خط جس میں اپنی قلم کی ساری توانائیاں صرف کر دوں
گی۔ اور اسی پر بس نہیں ہوگی تو اپنی قلم توڑ دوں گی۔ اسے ایک
دوست کی طرح سمجھاؤں گی۔ بہن کی طرح ڈانٹوں گی۔ اور ماں کی طرح اس کی
برائیوں کو درگذر کر دوں گی — یہ بچے ہی تو ہوتے ہیں جو ذرا سے گناہ
پر پشیمان ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ماں کی آغوش میں سکون ڈھونڈنے
لگتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مجاز میری ایک نہ ایک بات ضرور مان لے گا۔
وہ اتنا گیا گذرا تو نہیں ہے کہ میرے چند حروف اس کے دل پر کچھ اثر نہ ڈالیں
اور اس کہانی کا بھیانک پہلو یہ ہے مگر صاحب کہ جس دن میں
خط لکھ کر مجاز کو پوسٹ کرنے والی تھی اسی دن مجھے پتہ چلا کہ میری قلم
واقعی ٹوٹ چکی ہے وہ اب دیکھ نہیں سکے گی — میں سمجھتی ہوں
مجاز نے ٹھیک ہی تو کیا — وہ شاید یہ بات سمجھ گیا تھا کہ اگر اس نے
میری بات ٹالی تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ اور اسی لئے اس
نے ایک اچھے دوست کی طرح میری ساری باتیں مان لیں — ایک بھائی
کی طرح میری ڈانٹ کا بھی کوئی اثر نہیں لیا اور ایک ضدی مگر پیارے
بچے کی طرح اپنی ماں کی آغوش میں جا چھپا — یہ دھرتی — یہ زمین
ایک ماں ہی تو ہوتی ہے — جو ہر ضدی اور شریر بچے کو، جو اپنے گناہ
پر نادم ہوتا ہے اپنی برائیوں پر پچھتا رہا ہے، اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی
ہے — اے ماں — اے دھرتی — میں تجھے عقیدت بھرا سلام
کرتی ہوں، کہ تو نے میرے لال کو چھین کر اپنی گود میں بھر لیا۔ تو نے
اس کی ساری برائیوں پر پردہ ڈال دیا جو دنیا والوں کے لئے قابلِ مذمت
سہی، مگر میرے لئے قابلِ فخر ہیں۔

مجاز کے نام سے میں نے جو خط لکھا تھا اس میں میں نے
اسے جگہ جگہ "میرے بچے" اور "میرے نادان بالک" کہہ کر مخاطب
کیا تھا — میری کنواری ممتا اس دن ایک نئی کیفیت اور ایک نئے
پیار سے بوجھل ہو اٹھی تھی۔ مجاز ہم سے چھن گیا ہے میری سمجھ میں
نہیں آتا کہ میں اس کے لئے کیا لکھوں۔

مخلص — واجدہ تبسم

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
(مجاز)

حمیدہ سالم

جگن بھیّا

مجاز میرا بھائی ایک ڈرامائی انداز سے اس زندگی میں ابھرا اور اسی انداز سے ڈوب گیا۔ اس کی زندگی اُمنگوں، حوصلوں سے بھرپور شروع ہوئی اور محرومیوں، مایوسیوں میں گھر کر ختم ہو گئی۔ وہ زندگی کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی تمنائیں پالتا رہا اور اس کی اپنی زندگی دھیرے دھیرے تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی کو اپنی تخلیقی قوتوں کا قیمتی سرمایہ سونپا —— اپنی شاعری دی جس میں کائنات کو حسین بنانے کے حوصلے ہیں۔ مستقبل کو سنوارنے کی امنگیں ہیں۔ جوانی کی جولانی ہے۔ تجربہ کی ہوشمندی ہے۔ شوریدہ سری ہے۔ حُسن ہے۔ نفاست ہے۔ سادگی ہے۔ پُرکاری ہے۔ اور زندگی نے اسے پریشانیاں دیں۔ پشیمانیاں دیں۔ الجھنیں دیں۔ بے چینی دی۔ وہ زندگی سے محبت مانگتا رہا۔ مسرت مانگتا رہا، سکون چاہتا رہا۔ آسودگی چاہتا رہا اور زندگی رفتہ رفتہ اس سے دور کھنچتی گئی۔ یہاں تک کہ زندگی کی کھیتی کو خون دل سے سینچنے والے شاعر کو موت کی آغوش میں پناہ ملی۔

مجاز کی زندگی اور مجاز کی شخصیت کی کمزوریوں اور خوبصورتیوں کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے جس کے ساتھ مجاز کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مجاز اودھ کے ایک مشہور قصبہ ردولی کے ایک کھاتے پیتے خاندان میں پیدا ہوئے یہ خاندان اور قصبہ جس میں مجاز نے جنم لیا دونوں ہی کچھ اپنی خصوصیات رکھتے تھے۔ زمینداری کے خاتمے سے پہلے ردولی کی تمام تر آبادی زمینداروں اور تعلقداروں پر مشتمل تھی۔ وہاں کے ماحول میں جاگیردارانہ نظام کی تمام خوبیاں اور خامیاں گھٹی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہاں کا کلچر اور تہذیب کی سطح بلند تھی۔ وہاں کی زندگی میں سلیقہ تھا خوش مذاقی تھی۔ لوگ اچھا کھاتے تھے اچھا پہنتے تھے۔ رکھ رکھاؤ میں۔ وضعداری میں۔ خاطر تواضع میں یقین رکھتے تھے۔ پرانی روایتوں سے آخر دم تک چمٹے رہنے میں اعتقاد تھا۔ رسم و رواج کی پابندی ایمان تھا۔ دکھاوے اور نمائش کو اہمیت حاصل تھی۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر دھوم دھام کی تقریبیں ضروری تھیں۔ ہر تہوار پر برادری بھر میں حصے بٹنے لازمی تھے۔ یہ ڈھانچہ زمینداری کی کمزور بنیادوں پر کب تک کھڑا رہتا۔ آخر کو بیٹھ گیا اور آج ردولی میں سوائے عمارتوں کے کھنڈر اور افسردہ و اداس چہروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجاز کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اپنی بچپن کی ہر یاد انھیں بہت عزیز تھی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں بھی جب کبھی اماں ان کی بچپن کی ردولی کا ذکر چھیڑتیں وہ بہت دلچسپی سے اس میں حصہ لیتے، ہر چھوٹے بڑے کو پوچھتے۔ اب سے آٹھ دس سال پہلے تک وہ اکثر ردولی جایا کرتے تھے۔ لیکن اب باوجود اصرار کے بھی وہ وہاں نہیں جاتے تھے انھیں اپنے وطن کے زوال پر بہت دُکھ تھا۔

ہمارے دادا چودھری احمد حسین گو کہ تھے متوسط درجہ کے زمیندار لیکن اپنی سمجھ بوجھ اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے قصبہ بھر میں مشہور تھے۔ ان کے سات اولادیں تھیں۔ چار بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب کے سب ذہین اور ہوشیار۔ یہاں تک کہ

معاملہ فہمی، کارگزاری میں اس خاندان کی بیٹیاں اس قدر مشہور تھیں کہ قصبہ میں اب تک ان کی مثال دی جاتی ہے۔ جہاں تک تعلیم کا سوال تھا مسجد کے مکتب تھے اور کھاتا پیتا خاندان گھر میں مولوی رکھتا تھا۔ غرضکہ عربی، فارسی کی تعلیم اور حساب سے اتنی واقفیت کہ زمینداری کا پیشہ کامیابی سے چلایا جاسکے۔ یہ تھا معیار۔ دادا کی دو اولادیں بچپن ہی سے کچھ مختلف اور ذرا غیر معمولی سی طبیعتیں رکھتی تھیں۔ ایک تو میرے چچا بے خبر، مدہوش، رنگین مزاج اور آزاد منش۔ دوسرے میرے والد سنجیدہ، بردبار، کم سخن، محنتی اور مرنجان مرنج قسم کے انسان طبیعت پر تصوف پرستی کا رنگ غالب۔ دادا کو ان دونوں ہی طرف سے پریشانی تھی۔ چچا تو قابو میں نہ آسکے۔ باپ کی زندگی میں چھپ چھپ کر بعد میں کھلم کھلا جائداد کی پائی پائی بیچ کر خوب خوب رنگ رلیاں منائیں۔ میرے والد دنیا کے کھیڑوں میں پھنسا دیے گئے چودہ برس کی عمر میں چچا زاد بہن سے شادی کی گئی۔ لیکن ان کی علم دوستی میں فرق نہ آیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایک تعلقہ دار گھرانے میں فیض آباد سے آئے ہوئے ایک بڑے انگریزی داں استاد رکھے گئے والد نے ان سے استفادہ اٹھایا۔ اور زیادہ تر اپنی لگن کی وجہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ قصبہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ دادا کی بھی ہمت بڑھی۔ والد لکھنؤ بھیجے گئے اور کچھ اپنی کاوش اور کچھ گھر والوں کی مدد سے تعلیم کا انتظام ہوا۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تک کی نوبت آئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کی نوبت آئی۔ ردولی کے یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے زمینداری کے باوجود کسی دوسرے پیشے کو اپنایا۔ غرضکہ مجاز اس ابھرتے ہوئے خاندان میں پیدا ہوئے جو ایک طرف تو پرانی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھا دوسری طرف نئی قدروں کو بھی اپنا رہا تھا۔ اس خصوصیت کی جھلک مجاز کی شخصیت میں بھی تھی اور کلام میں بھی۔ ہماری ماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بالکل ان پڑھ تیز، ذہین زمانہ شناس، فطرتاً شوقین مزاج، تفریح پسند۔ جذباتیت کا رنگ غالب۔ مجاز کی شخصیت میں ماں باپ دونوں کا ملا جلا رنگ تھا۔ باپ کی طرف سے نیک نیتی۔ کم سخنی۔ حقیقت پسندی اور طبیعت کی گہرائی پائی۔ ماں کی طرف سے طبیعت میں حُسن پرستی۔ زود حسی۔ اثر پذیری اور جذباتیت ملی۔ کاش ان کے حصے میں باپ کی طبیعت کا ٹھہراؤ۔ استقلال۔ ارادے کی مضبوطی اور عاقبت اندیشی ملی ہوتی۔ لیکن ان کی زندگی کو تو یوں بکھرنا تھا۔ زمانے کو تو حالات کے ہاتھوں فنکار کی موت کے موت کے تماشے دیکھنے تھے۔ ان کی طبیعت میں وہ مضبوطی نہ تھی جو ان کے دل و دماغ کی نزاکت کو ڈھال بن کر محفوظ رکھ سکتی۔

مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان پیدا ہوئے۔ ان سے بڑا ایک بچہ دو ڈھائی سال کی عمر میں ختم ہو چکا تھا اس لئے بہت لاڈ اور منت مرادوں میں پالے گئے۔ محرم کی ساتویں کو فقیر بنتے۔ دسویں کو پایک بنائے جاتے۔ ایک کان میں بُندا پڑا ہوا تھا جو چھ سال کی عمر میں اجمیر لے جاکر اُتارا گیا۔ ہر دکھ بیماری پہ صدقے اُترتے۔ خیراتیں ہوتیں۔ نو دس سال کے تھے اکلوتے خالہ زاد بڑے بھائی کا درخت سے گر کر انتقال ہو گیا۔ پھر کیا تھا ماں اور نانی دیوانہ وار ان کو تمام حادثات و خطرات سے بچانے کی ہر ممکن کوشش میں لگ گئیں۔ مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر اکیلے قدم نکالیں۔ ہر وقت ایک نوکر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ عمر کے آخر تک کوئی صبح ایسی نہ گزری جب ماں نے ان کی زندگی کے لئے دو رکعت شکرانہ کی ادا نہ کی ہوں۔ اب سے کچھ ہی سال پہلے تک روزانہ رات کو ان کے سرہانے دو آنے رکھے جاتے جو صبح خیرات کر دیئے جاتے۔ غرضکہ ان کی ہر سانس کے ساتھ ماں کی دعائیں وابستہ تھیں اور ہر قدم کے ساتھ حسرتیں اور آرزوئیں۔ بچپن ہی سے ہم سب نے محسوس کیا گویا ماں کی زندگی کا محور وہی ہوں۔ ان حالات میں ہم بھائی بہنوں کے دل میں ان کی طرف سے رقابت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ لیکن یہ ان کی اپنی طبیعت کی سادگی۔ معصومیت اور خلوص تھا جو ایسی بدمزگی کی فضا گھر میں کبھی پیدا نہ ہوئی ماں نے ان کی پرورش میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں اور آنے والی مسرتوں کے خواب دیکھے ہیں اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے

کر ان کی طبیعت میں اسی بنا پر پڑی کہ بچپن سے راتوں کو جاگنے کی عادت تھی۔ کسے معلوم تھا کہ بچپن کی یہ شب بیداری اور بے چینی
آخر عمر تک ان کا ساتھ دے گی۔

جگن بھیا بچپن سے بلا کے شریر اور بے خبر تھے۔ بہنوں کو چھیڑنا۔ بھائی سے لڑنا۔ سب کے مٹھائی کے حصے چھپ چھپ کر
کھا لینا۔ کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر ان کے اندر کی ماہیت معلوم کرنا۔ گلی ڈنڈا اور دھول دھپا۔ یہ تھے ان کے محبوب مشغلے۔ آپا میری
بڑی بہن ان سے بہت بڑی تھیں سو ان سے ڈرتے تھے اور ان کے رعب میں رہتے تھے۔ ان کا برتاؤ بھی بہن سے زیادہ ماں
کا سا تھا۔ حنیفہ آپا اور انصار بھائی سے ان کا اوپر تلے کا سا معاملہ تھا۔ بچپن میں ان تینوں کی ایک منٹ نہ بنتی۔ حنیفہ آپا کی
گڑیوں کی چُٹیا پکڑ کر نچانے میں انھیں خاص لطف ملتا تھا۔ غرضکہ ہر وقت ان تینوں کے مقدمے پیش ہوتے رہتے تھے۔ پر فیصلہ
زیادہ تر جگن بھیا ہی کے حق میں ہوتا تھا۔ کیونکہ ابا کے علاوہ کوئی بھی تو غیر جانبدارانہ طور پر فیصلہ نہیں دیتا تھا۔ جگن بھیا
سب ہی کے لاڈلے تھے۔ اور ابا ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر لکھنؤ رہتے تھے۔ جب تعطیلوں میں آتے تو جگن بھیا کا رنگ ہی بدلا
ہوا ہوتا۔ ابا کا ایک حد تک روایتی ادب و لحاظ انھوں نے اپنی عمر کے آخر لمحے تک کیا۔ دیوانگی کے دور بھی گذرے لیکن ابا کے سامنے
انھوں نے کبھی سگرٹ نہ پی۔ یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی کلام بھی نہیں سُناتے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹی تھی۔ میری طرف
ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ دوسروں کی مٹھائی چُراتے اور مجھے کھلاتے۔ میری پرورش میں ماں کا ہاتھ
نہ تھا۔ ماں کے بعد میں ان سے ہی مانوس تھی۔ ہر وقت ان سے چپٹی رہتی۔ میرا نام بھی ان ہی کا رکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ایک
دلچسپ واقعہ ہے۔ جگن بھیا بچپن ہی سے بہت حُسن پرست تھے۔ کوئی خوبصورت بیوی دیکھ لیتے بس دنیا و مافیہا سے بے خبر
ہو کر گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک
خوبصورت دلہن بیاہ کر دو لی آئیں۔ ان کا نام حمیدہ تھا۔ ان کے پیچھے جگن بھیا کا دیوانگی کا عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا
تھا ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا۔ جانے محض چاہت میں یا اس اُمید پر کہ شاید نام ہی کی لاج رکھ میں خوبصورت نکل جاؤں
مگر میں اکثر ان سے لڑتی تھی کہ چہرہ کی خوبصورتی الگ رہی مجھے نام کی خوبصورتی سے بھی محروم کر ڈالا۔ گھسا پٹا نام رکھ
دیا۔ ہنستے تھے اور کہتے تھے۔ ارے پگلی خوبصورتی کہیں ناک آنکھ کی ہوتی ہے۔ اصل خوبصورتی تو دل کی ہوتی ہے جو چہرہ
پر [illegible]۔ میں پانچ سال کی تھی کہ مجھے چیچک نکلی اور اس غضب کی کہ سارا جسم دانوں سے لد گیا۔ ایسے عالم میں جو گھناؤنا
منظر رہا ہوگا اس کا اندازہ ہو ہی سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دور سے بو آتی تھی۔ ابا نے احتیاطاً سب بچوں کا میرے پاس آنا منع کر رکھا
تھا لیکن جگن بھیا چھپ چھپ کر میرے پاس پہنچ جاتے۔ میرے دانوں پر نیم کی پتیوں سے کھجلی کرتے۔ مجھے کہانیاں سُناتے
لطیفے سُناتے۔ آخر کو انھیں منع کرنا ہی چھوڑ دیا گیا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ ان کے دل میں کتنی نرمی تھی۔ کیسا گداز تھا۔ طبیعت میں کتنا
خلوص تھا کیسی ہمدردی تھی جو وہ میرے گھناؤنے قرب کو اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں پر ترجیح دے پاتے تھے۔ ویسے بھی بیماروں کی
تیمارداری کا ان میں بڑا جذبہ تھا۔ ہم میں سے کوئی بیمار ہوتا تو دوا پلانے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہوتی اور خاندان کا یہ لاخبرا اور
لاابالی بچہ اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو پوری کامیابی کے ساتھ سنبھالتا۔

جگن بھیا کی طبیعت میں بچپن ہی سے ایک قسم کی معصومیت اور سادگی تھی جس کی وجہ سے وہ سب کو عزیز بھی تھے [illegible]
ماحول میں ملکیت کا احساس بچہ کی گھٹی کے ساتھ سرایت کرتا ہے۔ لیکن وہ فطرتاً بے خبر اور لاابالی تھے۔ دوسروں کی چیز اپنے
تصرف میں لے آنا اپنی چیز دوسروں کو دے دینا ان کی عادت رہی۔ گھر کے نوکروں چاکروں سے ان کی بھائی برادری کے تعلقات
تھے۔ ایک گھر کا پرانا نوکر شرف الدین سے ان کی بہت گہری چھنتی تھی۔ وہ ان کے گلی ڈنڈے کا ساتھی تھا۔ جوان ہو کر اس نے
دوسری جگہ نوکری کر لی تھی لیکن وہ اکثر بڑے بھیا کے پاس ملنے آیا کرتا۔ غرضکہ بچپن ہی سے وہ کچھ غیر معمولی سے تھے۔ ایک

کان کچھ خراب رہتا تھا اس لئے ذرا اونچا سنتے تھے۔ میرے ایک ماموں انھیں "بہرے اُدّو" کہتے تھے۔ ایک چچا انھیں "ٹُرّے شاہ" اور کچھ سنکی۔ یہ نام سولہ سترہ برس کی عمر تک رائج رہے۔ یہاں تک کہ ماں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ اب لڑکا جوان ہوا ہے اسے سڑی سنکی کہنا مناسب نہیں۔

شوخ، شریر اور بے خبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین تھے۔ پڑھائی میں ہوشیار اور حساب میں خاص طور پر بہت تیز تھے جماعت میں ہمیشہ اچھے طالب علموں میں شمار رہا۔ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کود کی وجہ سے گھٹنے ہمیشہ زخمی رہتے تھے۔ اور ماں بے چاری نئے نئے پاجاموں میں پیوند لگاتے لگاتے اور رفو کرتے کرتے عاجز تھیں۔ لانگ جمپ اور ہائی جمپ کی ہر وقت مشق ہوتی رہتی تھی۔ گھر کے نہ جانے کتنے پلنگ ان کی اس مشق کی نذر ہوئے ہوں گے۔ پلنگ کھڑے کر کر کے ان پر سے کودتے تھے۔ غرض کہ گھر میں ہم سب کے لئے ہر وقت وہ تفریح اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے رہتے۔

پڑھائی میں ہوشیار ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کا بھی سلیقہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی تعلیم میں انھوں نے بہت دلچسپی لی۔ صفیہ آپا کو انگریزی انھوں نے ہی شروع کروائی۔ میری تو درس و تدریس کی تمام ذمہ داری انھیں کے سر تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کی یاد کا نقش میرے ذہن پر بہت گہرا ہے۔ پڑھنے میں میرا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ نہ جانے کتنے قاعدے میرے لئے آئے ہوں گے اور میں الف زبر آ اور ب زبر با سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جانے میں غائب کر دیتی تھی یا غائب ہو جاتے تھے میری تمام دلچسپی گڑیوں، ہنڈکلیوں یا پھر سہیلیوں کے ساتھ محلے بھر میں گھومنے میں تھی۔ ایک دن استانی جی نے بالکل مایوس ہو کر ماں سے میری شکایت کر دی۔ ماں نے مجھے بلا کر بہت ہی رقت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ نہ میری شکل نہ صورت آخر پڑھوں گی نہیں تو پھر کہاں کھپوں گی۔ تصور بہت خوفناک تھا۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ جگن بھیا اس منظر سے بہت متاثر ہوئے فوراً اٹھے اور ردی کے صندوق سے ایک ننھے بادامی رنگ کا قاعدہ نکال کر لائے۔ استانی جی سے میرا پڑھنا ختم کروا کر مجھے خود پڑھانا شروع کیا۔ اس دن سے میں چل نکلی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان کے پڑھانے کا ڈھنگ تھا یا ہم دونوں کے درمیان کا جذباتی بندھن۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو اس دن سے پڑھائی میں بددلی اور بدشوقی ختم ہو گئی۔ جس وقت تک میرا اسکول میں داخلہ نہ ہوا وہی مجھے پڑھاتے رہے۔ اردو، انگریزی، حساب سب ہی کچھ ان کی ذمہ داری تھی۔ چھوٹے موٹے مضمون لکھواتے اور سب کے سامنے پڑھوا پڑھوا کر سنتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن اسے بھی فطرت کی ستم ظریفی ہی سمجھئے میرا رجحان ان کے مذاق سے بالکل برعکس۔ بی اے کے بعد ان کا اصرار تھا کہ میں اردو لوں۔ لیکن مجھے اپنے ادبی مذاق کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ سو میں نے معاشیات کا انتخاب کیا جگن بھیا کو اس وقت مجھ سے خاصی مایوسی ہوئی۔

غرض کہ جگن بھیا نے جب بچپن سے جوانی میں قدم رکھا۔ ان کا شمار ہونہار نوجوانوں میں ہوا۔ جائداد تھی۔ گھر۔ باپ سرکاری ملازم تھے۔ شکل و صورت تھی۔ صحت تھی۔ کیا کمی تھی۔ ہر لڑکی والے کی نظر ان پر تھی۔ شادی کی باتیں شروع ہوئیں۔ نانی کی خواہش تھی کہ دلہن کم عمر ہو۔ ماں کی تمنا تھی کہ بہو خوبصورت ہو۔ بہنوں کی آرزو تھی کہ بھاوج پڑھی لکھی ہو۔ باپ نے کہا کہ بیٹا جب تک تعلیم ختم کر کے اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہو شادی کا کوئی سوال نہیں۔ ماں اور نانی دباؤ میں آ کر چپ ہوئیں۔ بہنوں نے باپ کی بات کا وزن محسوس کیا اور معاملہ دب گیا۔ جن لوگوں کے دلوں میں جگن بھیا کو داماد بنانے کی آرزو تھی ان کے دلوں میں رنجش نے جگہ لی۔ رویہ اور رجحان بدلنے لگے۔ جگن بھیا کی رنگین مزاجی، ہم عمر لڑکیوں اور بھاوجوں سے چھیڑ چھاڑ جو ان کے حسن خلاق کی دلیل سمجھی جاتی تھی اب ان کی آوارگی کی دلیل سمجھی جانے لگی۔ ان کے لاابالی پن کا جو ان کی معصومیت کا ثبوت سمجھی جاتی تھی غیر ذمہ داری میں شمار ہونے لگا۔ دھیرے دھیرے عیب جوئی اور نکتہ چینی کے لئے زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوتا گیا اور خاندان کا یہ محبوب نوجوان محض شرابی کی صورت اختیار کر کے رہ گیا۔

جگن بھیا کی بالکل ابتدائی تعلیم ردولی کے ایک مکتب میں ہوئی۔ میٹرک انھوں نے امین آباد ہائی اسکول لکھنؤ سے کیا۔ اسی زمانہ میں ابا کا تبادلہ آگرہ کا ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سینٹ جانس کالج میں ایف۔ ایس سی میں داخلہ لیا۔ انجینئرنگ کی لائن اختیار کرنے کے خیال سے ریاضی کا مضامین میں انتخاب ہوا۔ آگرہ میں پڑوس فانی کا ملا۔ اور کالج میں جذبی بھائی کا ساتھ رہا۔ طبیعت کا فطری رجحان جواب تک اپنے کمرے کے پھولوں کے گلدان سے سجا کر رکھنے۔ بچوں کو ڈرائنگ بنا کر دینے۔ دیوالی پر میرے لئے گھروندا بنانے اور اچھی اچھی صورتیں دیکھ کر خوش ہونے پر مطمئن تھا۔ ابھرا اور اپنا صحیح راستہ ڈھونڈنے پر مائل ہوا۔ شاعری کا دور ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں ہم لوگ انھیں بورڈنگ میں چھوڑ کر علی گڑھ آ گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا پہلا موڑ شروع ہوا۔ وہ خود بھی اس موڑ پر کچھ وقفہ حیران پریشان ٹھٹک کر رہ گئے۔ پڑھائی میں ابتری پیدا ہونا شروع ہوئی۔ زندگی کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ امتحان میں فیل ہوئے۔ خود بتاتے تھے کہ امتحان کی کاپیاں بالکل سادی چھوڑ آتے تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ صبح کو پرچہ کیونکر حل ہوتا۔ وہ بھی حساب کا، کیمسٹری کا۔ گھر والے پریشان ہو اٹھے۔ انھیں علی گڑھ لے آئے۔ مضامین بدلے گئے۔ فلسفہ، معاشیات اور اردو کا انتخاب ہوا۔ دو سال حاضریاں پوری نہ ہو سکنے کے سبب امتحان نہ دے سکے۔ اللہ اللہ کر کے ۱۹۳۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔ پرانی روایتوں کے خلاف یونین کے اسٹوڈنٹ ہونے کے باوجود میگزین کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ داخلے کے ایک دو مہینے کے بعد دلی ریڈیو اسٹیشن سے آواز کی سب ایڈیٹری کی جگہ نکلی۔ بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ جگہ اچھی ہے۔ مذاق کے مطابق ہے۔ موقعے بار بار نہیں آتے۔ درخواست دی اور لے لئے گئے۔ علی گڑھ کا دور جگن بھیا کی ادبی زندگی اور سیاسی و سماجی شعور کا روشن ترین دور ہے۔ زیادہ تر اچھی نظمیں اسی زمانے میں کہیں۔ سردار جعفری، سبط بھائی، اختر، اور جگن بھیا کا ایک گروپ تھا۔ یہ سب نام ایسے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ انھیں بھلا نہیں سکتی۔ کوئی اچھا مقرر تھا۔ تو کوئی چوٹی کا ادیب تو کوئی محبوب شاعر۔ سب اپنے اپنے ہتھیاروں سے فرسودہ نظام سے لڑ رہے تھے اور نئی قدروں کو زندہ رکھنے میں منہمک تھے۔ علی گڑھ میں ایک نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ ایک نئی زندگی ابھر رہی تھی۔ لیکن مقرر کبھی کبھی اپنی زباں درازی سے دوسروں کو تکلیف پہنچا جاتا ہے۔ ادیب کے قلم کی تیزی کبھی کبھی کھٹکنے لگتی ہے۔ لیکن شاعر ـــــ وہ تو دلوں کا راز داں ہوتا ہے۔ وہ تو روح کا پیامبر ہوتا ہے۔ اس کی بولی میٹھی ہوتی ہے۔ اس کا پیام سچا ہوتا ہے۔ پھر مجاز ـــــ جس کے یہاں "شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز" دونوں ہی ہیں۔ جس کے دل میں باغی کی آگ جس کی رگوں میں جوانی کا جوش جس کے نغمے میں نوک تیغ کا زور تھا جس نے انقلاب کے نعرے لگانے کے بجائے انقلاب کے راگ گائے۔ جس نے علی گڑھ کو اپنا چمن قرار دیا اور ایسا چمن جہاں ؎

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

تدبیر کے پائے سنگیں پر جھک جاتی ہے تقدیر یہاں
ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں

یہ بلبل اپنے چمن میں سب ہی کو عزیز تھا۔ استادوں کا منظور نظر۔ طلباء کے لئے مایۂ ناز۔ عورت کو نکتہ داں بنانے والا شاعر لڑکیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گرلس کالج میں ہر زبان پر اس بلبل کے راگ تھے۔ مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اس کا قد کتنا اچھا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ کسی سے محبت تو نہیں کرتا۔ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔
جگن بھیا ۱۹۳۵ء میں دہلی گئے۔ اور تقریباً ایک سال تک آواز کی سب ایڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ملازمت کے

نازیں گھر کا ایک پرانا ملازم عاشق علی ان کے ساتھ تھا جو سیاہ سفید کا مالک تھا۔ پہلی کو تنخواہ اس کے حوالے کرتے اور پلٹ کر نہ پوچھتے کہ کب اور کیسے صرف ہوئی۔ ان کا گھر مہمانوں اور بہی خواہوں کی وجہ سے ہمیشہ کیمپوں کی شکل اختیار کئے رہتا۔ گھرداری کے سلسلے میں جتنی بھی چیزیں خریدیں سب میں خوش مذاقی کا لحاظ ضرور رکھتے تھے۔

شاعر ہونے کی حیثیت سے شراب کی عادت تھی ہی۔ ریڈیو اسٹیشن کے ماحول میں اور بھی چمکی۔ لیکن اس وقت تک مجاز شاعر محفل وفا مطرب بزم دلبراں" تھا۔ اس کی زندگی "غرق شراب تند و تیز" نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک علی گڑھ کا شاعر تھا۔ دلی کا شرابی نہ تھا۔ بہرحال ریڈیو اسٹیشن کی اندرونی پالیٹکس اور یو۔پی و پنجاب والوں کی رسہ کشی نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ جگن بھیا ملازمت ترک کر کے یہ کہتے ہوئے دلی سے رخصت ہوئے ؎

رخصت اے دلی تری محفل سے اب جاتا ہوں میں
نوحہ گر جاتا ہوں میں نالہ بہ لب جاتا ہوں میں
جاتے جاتے تجھ سے اک پیماں کئے جاتا ہوں میں
اپنے عزم سرفروشی کی قسم کھاتا ہوں میں
تیری اس بزم حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں
آؤں گا میں اور باندازِ دگر آؤں گا میں

ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں ماں بہنیں چاند سی دلہن لانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں۔ تلاش جاری تھی۔ انتظامات ہو رہے تھے۔ یہاں تک ناؤنوں۔ ماشوں کے لئے جوڑے۔ پرجوں کے لئے لہنگے۔ کرتیاں۔ پاسیوں کے لئے شال دوشالے خریدے گئے تھے اور بس صرف چاند سی دلہن کا انتظار تھا۔ کسے معلوم تھا کہ جگن بھیا کی زندگی کا یہ افق ہمیشہ ہی ابر آلود رہے گا۔ یہ چاند کبھی نہ نکلے گا۔ ماں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔ بہنوں کی آرزوئیں کبھی بر نہ آئیں گی۔ انسان کی ضرورت تشنہ ہی رہے گی۔ شاعر کا تصور کاغذی ہی پیکر پہنے رہے گا۔ جگن بھیا وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شاعر سے عقیدت رکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے بہت محبت کی جا سکتی ہے۔ پر شادی تو نہیں۔ پیٹ روٹیوں سے بھرتا ہے اشعار سے تو نہیں۔

دلی کے قیام کے دوران جگن بھیا کے دل نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا زخم ان کی زندگی میں کبھی بھر نہ سکا۔ مرہم اور پھائے کا ذکر کیا۔ اس پر مزید چوٹیں لگتی رہیں اور دھیرے دھیرے ان کا پورا وجود ایک ناسور بن کر رہ گیا۔ ان کے اپنے لئے، گھر والوں کے لئے اور سماج کے لئے انھوں نے محبت کی ایسی گہری۔ ایسی پائیدار کہ آخر دم تک ان کے دم کے ساتھ رہی۔ لیکن قسمت دیکھو ہاتھ بھی بڑھایا تو کس ممنوعہ کی طرف ——۔ دلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی۔ چنچل۔ البیلی اور خوبصورت۔ لاڈ و پیار میں پلی ہوئی۔ عیش و عشرت کی عادی۔ ایک عدد بھاری بھر کم شوہر کی ملکیت یا مالک جو کچھ بھی سمجھئے۔ یہ بیل منڈھے چڑھتی تو کیونکر۔ لیکن شاعر قدموں پر موتی بکھیرتا ہے۔ سر پر پھولوں کی بارش کرتا ہے اور بدلے میں چند مسکراہٹوں کا خواہشمند ہو تو سودا مہنگا تو نہیں۔ شاعر بھی اپنی جگہ پر مطمئن تھا کہ ؎

میرا نغمہ باعثِ دلداری خوباں تو ہے
میرا [illegible] درجہ نشاطِ جاں تو ہے

لیکن برا ہو اس سماج کا۔ اس کی ٹیڑھی ترچھی سخت نگاہوں کا۔ اس کی انگشت نمائی کا۔ ہر کھیل بگڑ کر رہ جاتا ہے۔ انسان کی تو کیا ذکر کیا شاعر کی واہ بھی خطرے میں پڑ گئی۔ غریب انسان کا کہنا کیا گھٹ کر رہ گیا۔ بے چارے شاعر کا دل ٹوٹ گیا۔

یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی ہر بربط شکستہ سے

بظاہر تو اتنا ہی ہوا لیکن قریب سے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کا پورا وجود سلگ کر رہ گیا اور سلگتے سلگتے ۱۹۴۰ء میں یہ آتش فشاں پھوٹ ہی نکلا۔ نروس بریک ڈاؤن کا یہ حملہ تھا۔ آج بھی مجھے وہ دن یاد ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتی تھی اور لکھنؤ ہی میں تھی۔ صبح سے شام تک اخبار سناتے سناتے یا پھر شیلے اور کیٹس کے مجموعے سناتے سناتے میری زبان خشک ہو جاتی تھی۔ ایک لمحہ کی خاموشی گوارا نہ تھی۔ ایسا لگتا جیسے اندر شعلے اٹھ رہے ہوں جنھیں باتوں کے چھینٹوں سے بجھانے کی کوشش ہو۔ بس یہ خبط تھا کہ فلاں فلاں مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور رقیب روسیاہ زہر دینے کی فکر میں ہے۔ سوائے ہم چند کے کسی کا پاس آنا گوارا نہ تھا محبت میں ناکامی کا انجام اپنے بھیانک انداز سے تماشے دکھا رہا تھا۔ علاج معالجہ ہوا۔ چار چھ مہینے کے لئے بڑی بہن کے ساتھ نینی تال چلے گئے اور خدا خدا کرکے تندرست و توانا ہو کر واپس آئے اور پھر نارمل زندگی بسر کرنے کی کوشش میں ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کچھ دن بمبئی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کام کیا۔ وہاں سے واپس ہوئے تو لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں 'نئے ادب' اور اس کے بعد 'پرچم' کی ادارت کرتے رہے۔ جب سب ساتھی ادھر ادھر بکھر گئے تو پھر دلی واپس گئے اور ہارڈنگ لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی جگہ پر کام کرنا شروع کیا۔ ماں بہنوں نے دل کی چوٹ کا علاج کرنا چاہا صفیہ آپا کی دوستوں میں سے ایک کو جگن بھیا سے کچھ ہمدردی اور کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے کچھ غیر مطمئن بھی تھیں۔ صفیہ آپا کی تحریک پر انھوں نے جگن بھیا کو اپنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ شکل و صورت کے اعتبار سے نہ حسینوں میں شمار ہو سکتا تھا اور نہ ہی بدصورتوں میں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ برسرِ روزگار تھیں لیکن طبیعتاً گھریلو قسم کی تھیں۔ جگن بھیا سے محض صفیہ آپا کے توسط سے بس ایک دو دفعہ کی ملاقات تھی۔ دل کے ملاپ کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن جگن بھیا نے سوچا کہ شاید سپردگی ہی میں نجات ہو اور زندگی کے منتشر تار یکجا ہو سکیں۔ زخم رِسنا بند کر دے۔ جذبات کا تو دلی میں گلا گھٹ ہی چکا تھا۔ جانے کس دل سے اپنے کو سمجھا کے سپرد کر پائے ہوں گے۔ بہرحال اس رشتے پر راضی ہو گئے اور بات ماں تک پہنچی کہ ایک دفعہ ..... کے سرپرست سے مل لیں اور معاملہ طے ہو جائے۔ اس زمانے میں جگن بھیا دلی لائبریری میں کام کر رہے تھے۔ وہاں سے بلائے گئے اور بردکھوے کے لئے سفر پر روانہ ہوئے۔ لاکھ سر پر ٹیڑھی ترچھی ٹوپی رکھی اور استری شدہ شیروانی پہن کر جاذبِ نظر لگنے کی کوشش ہو لیکن ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کالج کے پرنسپل کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ ہر مہینے پانے والے اسسٹنٹ لائبریرین میں کشش نہ پیدا ہو سکی۔ خالی ہاتھ لوٹا دیئے گئے۔ عورت کو آنچل سے پرچم بنانے کا پیام بھایا بہت تھا لیکن اس پیام پر عمل کرنا —— معاملہ خطرناک تھا۔ ایک طرف ہزاروں کمانے والا سرکاری عہدیدار۔ دوسری طرف دل شکستہ خالی جیب والا شاعر۔ زر کی جیت ہوئی۔ فن پھر شکست کھا گیا۔ شاعر نے ایک دفعہ دل کی آواز پر قدم اٹھائے تھے اور منہ کے بل گر گیا تھا۔ اس مرتبہ اس نے عقل پر بھروسہ کیا اور تھم تھم کر۔ رک رک کر احتیاط کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھایا پھر بھی ٹھوکر کھا گیا اور کھسیا کر رہ گیا۔ "تدبیر کے پائے سنگین پہ تقدیر نہ جھک سکی اور شاعر پر ۱۹۴۵ء میں دوسرا دیوانگی کا حملہ ہوا۔ اب وہ خود ہی اپنی عظمت کے راگ گاتا تھا۔ شاعروں کے نام کی فہرست تیار کرتا تھا اور غالب و اقبال کے نام کے بعد اپنا نام لکھ کر شجرہ ختم کر دیتا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوشش اور جان توڑ تیمارداری اور دلجوئی سے کسی طرح قابو میں آ ہی گئے۔ لیکن زندگی کا دھرا تو بدل نہ سکا۔ بیکاری اور تنہائی کا ساتھ رہا۔ شراب نوشی بڑھتی گئی۔ زندگی میں تلخیاں بڑھتی گئیں اور وہ ان تلخیوں کو غرقِ مئے ناب کرتے رہے۔ غرضکہ یہ سلسلہ جاری رہا اور اسی جال میں جگن بھیا کی زندگی، وجود سب ہی کچھ الجھ کر رہ گیا۔ لوگوں نے کہا مجاز کا علاج شادی۔ پر یہ علاج ہوتا تو کیونکر۔ مجاز کی جیبیں خالی تھیں۔ جہاں بھی گھر والوں نے ہاتھ پھیلایا جواب ملا بڑے کے ساتھ تو نہیں البتہ چھوٹے کے ساتھ چاہو تو کر لو۔ وہی مجاز جو کبھی اس میدان میں آرزوؤں کا مرکز تھا کوڑا کرکٹ بن کر

رہ گیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ ان مایوسیوں کو جگن بھیا سے چھپائے رکھ سکیں۔ لیکن انھیں اندازہ ہو ہی جاتا اور سوائے اس کے کہ ان کی مسکراہٹ
میں تھوڑی سی تلخی اور گھل جاتی کسی طرح بھی ظاہر نہ ہوتا کہ وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں۔ ماں بیٹوں کی ہمت نے جواب دے دیا کہ وہ کسی
کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ایک طرف تو منہ توڑ جواب کا ڈر۔ دوسری طرف جگن بھیا کی رضامندی حاصل کرنے کا مسئلہ۔ کیونکہ تجربہ یہ ہو چکا
تھا کہ جنسی بھوک خواہ کتنی شدید کیوں نہ رہی ہو۔ عورت کی پرکھ ان میں ختم نہ ہوئی تھی (صرف دیوانگی کے عالم میں ایسا ہوا کہ یہ بھوک پوری
طرح سے ان پر حاوی اور یہ پرکھ ختم ہوئی) ماں کے ایک قریبی عزیز نے اپنی لڑکی کے لئے منظوری دے دی تھی۔ نیت کا حال خدا جانے۔
جانے اماں کی مایوسی اور پریشاں حالی سے متاثر ہو کر یا جگن بھیا کی بربادحالی پر رحم کھا کر۔ یا پھر انھیں سمجھ بوجھ کر اور ان کی قدر شناسی
کے طور پر۔ بہرحال وہ راضی تھے۔ جگن بھیا سے پوچھا گیا۔ کافی عرصہ تک ٹالا کئے۔ اپنے دل کو ٹٹولتے رہے اور آخر کو ماں سے کہہ ہی دیا کہ
ماں ابھی لڑکی میں میں کوئی کشش نہیں پاتا۔ اس کی قسمت پھوڑنے پر آپ کیوں تلی ہیں۔ یہ اپنی قسم کا ان کی زندگی میں دوسرا واقعہ تھا۔ ایک
دفعہ علی گڑھ میں ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ایک متمول آزاد خیال گھرانے کی نہایت تیز طرار لڑکی نے صفیہ آپا کے ذریعہ سے ان سے شادی
کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کا جواب جگن بھیا نے یہ دیا تھا "صفیہ مجھے کاغذی پھولوں سے دلچسپی نہیں" نفس مضمون دونوں
جوابوں کا ایک ہے۔ لیکن جن حالتوں میں دیئے گئے ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کا پہلا جواب اس وقت کا تھا جب وہ
فلک شاعری پر ابھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ترقی کا میدان دامن پھیلائے ہوئے تھا۔ امیدوں کے رنگ آمیز پرچم لہرا رہے تھے۔
اس لئے اس جواب کو تکبر اور خودسری کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا دوسرا جواب اس وقت کا ہے جب وہ بالکل ٹوٹ چکے تھے
در در سے ٹھکرائے جا چکے تھے۔ جنسی تشنگی کا شکار تھے۔ لیکن اس حالت میں بھی عورت سے زیادہ عورت کا تصور انھیں عزیز تھا
اس جواب میں ایثار ہے۔ شعور ہے۔ کردار کی بلندی ہے۔ بہرحال جگن بھیا کو ایک ساتھی نہ مل سکا جو ان کے دل کی آواز کو سمجھ سکتا۔ ان کو
سہارا دے سکتا جس کی ڈھارس سے وہ زندگی کی تھکن دور کر سکتے۔ انھیں رفاقت نصیب تھی تو وہ شراب کی۔ وہی ان کا واحد سہارا تھی
اندھیری رات کے مسافر کی منزل خود فراموشی کے دھندلکے میں اوجھل سی ہو گئی۔ ان کے چہرے کی تابانی پر دھیرے دھیرے بے بسی کا
پردہ گہرا ہوتا گیا۔ آنکھوں کی دمک کی جگہ اتھاہ گہرائی نے لی جس میں امیدیں، آرزوئیں دفن ہوں، یاس و محرومی جھانک رہی ہو۔ کس
غضب کی گہرائی تھی ان آنکھوں میں اور کیا کچھ پوشیدہ تھا ان میں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا دل بجھ سا گیا ہو۔ جیسے ان میں ابھرنے کی خواہش
باقی ہی نہ ہو۔ غرضکہ سہم سکڑ کر بقول عصمت آپا کے وہ بالکل نکھٹو ہو گئے۔ نکھٹو بھی ایسا جو شرابی ہو اور شرابی بھی ایسا جسے پیتے وقت اس کا
بھی ہوش نہ رہتا ہو کہ کتنی پی رہا ہے اور کیسی پی رہا ہے۔ میں نے اکثر چاہا کہ ان سے منت کروں التجا کروں کہ وہ اپنے کو سنبھالیں لیکن جب
بھی میں نے ارادہ کیا میری ہمت جواب دے گئی۔ "آوارہ" کا مصنف اتنا سخت دل نہیں ہو سکتا کہ ماں کے آنسوؤں سے نہ پگھل سکے
جس وقت ماں انھیں سمجھاتیں، زندگی کا اونچ نیچ سمجھاتیں۔ گھر کی بگڑی ہوئی حالت کا احساس دلاتیں۔ اپنی محبت کا باپ کی عزت
کا واسطہ دیتیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے کہ ماں کے آنسوؤں کا ہر قطرہ ان کے دل پر نشتر کی طرح لگتا۔ پھر بھی نہ جانے وہ کس الجھاؤ
میں تھے جس سے اپنے کو نہ نکال پائے۔ غرضکہ وہی جگن بھیا جو ہماری امیدوں آرزوؤں کا مرکز تھے پریشانیوں اور الجھنوں کا مرکز بن کر رہ گئے
کبھی ہم ان کی شراب نوشی اور خود فراموشی پر جھنجھلاتے۔ تلخ ہوتے۔ جی چاہتا کہ انھیں اتنا جھنجھوڑیں کہ ان کے ہاتھ کے "قریب بے خودی دیتے
ہوئے بلور کے ساغر" جھنجھنا کر ٹوٹ جائیں اور وہ چونک کر پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑیں۔ کبھی جی چاہتا کہ ان سے چمٹ کر اتنا روئیں
کہ ہمارے آنسو ان کے وجود کو بہائے جائیں اور وہ پھر یہ کہہ اٹھیں ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایسا لگتا ہے جیسے ان کا عدم وجود سب برابر ہو۔ جیسے وہ ہمارے درمیان ہوتے ہوئے بھی ہماری پہنچ سے باہر ہوں جیسے

وہ بہت دور خلاؤں میں گم ہو رہے ہوں۔ پتہ ہی نہ چلا کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں کیا پوشیدہ ہے۔ چوٹیں کھاتے تھے اور خاموش رہتے تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں ایک دفعہ بھی تو ایسا نہ ہوا کہ انھوں نے ایک دفعہ بھی زندگی کی شکایت کی ہو یا کسی کا شکوہ کیا ہو۔ زندگی میں ایسا زبردست تضاد اور اپنی زندگی سے اتنی بے نیازی۔ تلخیاں سہتے عمر بیتی اور مزاج میں ذرا تلخی نہ پیدا ہوئی۔ کبھی تو کسی بات پر جھنجلا اٹھتے۔ بیزاری کا اظہار کرتے۔ سب کچھ خاموشی سے سہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۲ء میں تیسرا اور آخری نروس بریک ڈاؤن کا حملہ ہوا اور اس غضب کا شدید کہ خدا کی پناہ۔ گھر میں ٹکنا ہی گوارا نہ کیا۔ دلی کے گلی کوچوں کی خوب خوب خاک چھانی۔ جنسی محرومی کے تماشے دلی والوں نے خوب خوب دیکھے۔ جس انسان نے عالم ہوش میں کبھی بھی کوئی چھچھوری اور رکیک حرکت نہ کی تھی وہ ہر لڑکی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گھر والے ہر لمحہ اس خبر کے منتظر تھے کہ مجاز موٹر سے کچل گیا۔ ٹھٹھرا ہوا سڑک پہ پایا گیا۔ انجام یہی ہونا تھا لیکن کچھ دن ٹھہر کر۔ وہی ستر سالہ ماں جس نے بیٹے کے مستقبل کے نہ جانے کتنے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جانماز پہ بیٹھ بیٹھ کر دعائیں مانگتی تھی یا الٰہی اسے اٹھا لے یا مجھے۔ جو میں اس طرح کے تماشے نہ دیکھوں۔ دلی سے جوش صاحب کا خط آیا کہ مجاز کو آگرہ بھیج دیا جائے۔ مجاز اور آگرہ کا پاگل خانہ۔ دل پر کیسی چوٹ لگی۔ لیکن مجاز پاگل تھا۔ اس حقیقت سے کیونکر انکار ہو سکتا تھا۔ پاگل کو آخر کہاں تک اور کیسے بھگتا جاتا۔ جوش صاحب کو میں نے خط لکھا کہ اپنے رسوخ استعمال کر کے رانچی میں جگہ دلوا دیں۔ جوش صاحب کو خط ملا یا نہیں۔ بہرحال میں جواب کے انتظار ہی میں رہی۔ ڈاکٹر ڈیوس رانچی اسپتال کے انچارج سے براہ راست خط و کتابت کی۔ جگن بھیا کی لائف ہسٹری لکھ کر بھیجی۔ شاید ان کی زندگی کے واقعات سے متاثر ہو کر اس نے بی کلاس وارڈ میں ایک بیڈ دے ہی دیا۔ ورنہ ایسے اسپتالوں میں بغیر سفارش کے جگہ کب ملتی ہے۔ مجاز کو بہ مشکل رانچی بھیجا گیا۔ بوڑھے باپ نے اپنی پونجی کی آخری کوڑی انھیں بچانے کے لئے لگا دی۔ اور چھ مہینے بعد وہ بچ کر آ گئے۔ ان کی واپسی کے ایک مہینے بعد صفیہ آپا کا انتقال ہوا۔ اس صدمہ کا اثر ان پر بجلی کے شاک کا سا ہوا۔ جیسے یکدم چونک پڑے ہوں۔ ایک دفعہ پھر ان میں ذمہ داریوں کا احساس چمکا۔ جاوداویس کی پڑھائی دیگر مشغلوں میں دلچسپی لینا۔ ان کی دلجوئی کرنا۔ زیادہ تر وقت گھر پہ گزارنا۔ شراب سے قطعی پرہیز رات کو جی بھر کر سوتے۔ دن میں ہنستے کھیلتے۔ باتیں کرتے۔ گھنٹوں سب کے ساتھ تاش کھیلا کرتے۔ بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے۔ تصویریں بنا بنا کر سب میں بانٹتے۔ چھوٹے بچوں کو ایک دوسرے سے لڑواتے۔ ایسا لگتا جیسے جاوداویس عنو عرفی کے بچپن میں میرا بچپن دہرا رہا ہو۔ جگن بھیا پھر بیس پچیس سال پہلے والے جگن بھیا بن گئے ہوں۔ لیکن بنیادیں تو بدل نہ سکیں۔ زندگی کا یہ نیا ڈھانچہ کیونکر ٹھہرا رہتا کاش اس وقت ان کا ہاتھ کسی نے تھام لیا ہوتا۔ ان کے لئے کسی نے "ساز بیداری" اٹھا لیا ہوتا۔ لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ ان کی موت کو ان کی زندگی کا نقطۂ عروج بننا تھا۔ انھیں تو یہ دکھانا تھا کہ جیتے جی مرنا کسے کہتے ہیں۔ اور مر کر بھی کیسے جیا جا سکتا ہے۔ غرض کہ چھ مہینے تک جگن بھیا بالکل نارمل رہے۔ چاہنے والے ساتھی اور سچے دوست اپنے اپنے کام دھندوں میں ادھر ادھر لگے ہوئے تھے ان کی ظرافت طبع اور بذلہ سنجی سے لطف اٹھانے والے نا سمجھ دوستوں اور ان کی شاعری کو کھلونا سمجھ کر دل بہلانے والے "نادان ادب نوازوں نے انھیں پھر شراب خانہ کی طرف رجوع کرنا شروع کیا۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد ان کے قدم تیزی سے اس طرف اٹھنے لگے۔ راتوں کو مدہوشی کے عالم میں دو تین بجے گھر واپس آنا۔ دن میں دس گیارہ بجے خمار کے عالم میں اٹھنا۔ منہ ہاتھ دھو کر برآمدے میں پڑے ہوئے پلنگ پر ناشتہ کرنا تھوڑی دیر اخبار کے ورق ادھر ادھر پلٹنا۔ یہ تھا ان کا پروگرام۔ اس درمیان موقع پا کر ماں کوشش کرتیں کہ رات کی کیفیت کا انھیں احساس دلائیں اور آئندہ کے لئے احتیاط پر آمادہ کریں۔ چپ چاپ سب کچھ سنا کرتے۔ ایک خاموشی ہر بات کا جواب تھی۔ جب اندرونی کشمکش برداشت سے باہر ہو جاتی تو اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے اور پھر سب بچوں کو یکجا کر کے ان کے ساتھ کھیل میں اپنے کو بھولنے کی کوشش کرتے۔ گھر میں ماشاءاللہ بچوں کی تعداد بہت طویل تھی۔ سات عدد بچے تھے۔ دو صفیہ آپا کے، دو میرے اور تین میرے بھانجے کے۔ ان سب میں بھانجے کا تین سالہ بچہ عرفی انھیں عزیز تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ اس کا بچپن بالکل جگن بھیا جیسا ہے۔ بہت شریر اور بے خبر۔ اس سے خود کو استاد کہلاتے اور کہتے کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ اس کو اپنے پاس کھڑا کر لیتے تب کھانا کھاتے

وہ اپنی گندی گندی انگلیوں سے سالن کے پیالے کی بوٹی کی چھین جھپٹ کیا کرتا۔ سو کر آدھی آدھی پر معاملہ طے ہوتا۔ خود بھی بہت گندے طریقے پر کھانا کھاتے۔ چاول میں دال سالن ملا کر انگلیاں اس قدر تیزی سے چلاتے گویا کسی ساز پر چل رہی ہوں۔ یہاں تک کہ پلیٹ میں چھین سا پیدا ہو جاتا تب منھ میں لقمے لے جاتے۔ منہ ذرا کم کھلتا تھا اس لئے کھاتے وقت ہمیشہ ایک قسم کی سڑکنے کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ سب بچے ان کو بچو دادا کہتے تھے۔ عالم ہوش میں بھی وہ ایک طرح کی خود فراموشی ان بچوں میں کھو کر حاصل کر لیتے تھے۔ شام ہوتی کپڑے بدلتے۔ کپڑوں کی صفائی اور نفاست کا لحاظ ہر عالم میں رہا۔ تیسرے دن ضرور کپڑے تبدیل کرتے تھے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے۔ ایسا لگتا کہ جیسے سوچ رہے ہوں کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہفتہ ہفتہ گھر سے نہ نکلتے۔ لیکن آخر ایسے کب تک گذر ہوتی۔ آخر کو چل ہی دیتے۔ شاید اس ارادے کے ساتھ کہ اب اپنے کو کھو کر واپس نہ آؤں گا۔ لیکن باہر جا کر ان کی قوت ارادہ و عمل جواب دے جاتی اور پھر اسی بدحالی میں واپس آتے کبھی پیدل اور کبھی رکشا میں۔ کھانا، سگریٹ اور پان سمیت ان کے کمرے میں رکھ دیا جاتا۔ یہ مدتوں پرانا معمول تھا۔ اگر کچھ ہوش میں ہوتے تو کھا لیتے ورنہ پھر صبح کھاتے۔ غرض کہ دن کو بیکاری اور رات کو شراب نوشی کا زہر گھن کی طرح ان کی زندگی کو لگتا رہا۔ اور ہم سب یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر ایک دن سب نے سن لیا کہ مجاز مر گیا۔ پتھروں پر سسک سسک کر۔ ٹھنڈ میں ٹھٹھر کر۔ یہ مجاز کی موت تھی۔ فنکار کی موت۔ شاعر کی موت۔ کہانی پوری ہوئی۔ ڈرامہ ختم ہوا۔ پردہ گر گیا۔ پر ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیسے ہوا۔ یہ خلش یہ ٹھسک ہر حساس دل و دماغ میں باقی رہ گئی۔

اکاؤنٹ

امن کی تحریک کے سلسلے میں نئی دہلی ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ مجاز مرحوم سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ میرے ایک دوست نے میرا تعارف ان سے کرایا

”آپ ہیں مجاز لکھنوی۔ آپ ہیں آزاد بہادر پوری۔“

دو ہاتھ بڑھے اور مل گئے۔ میں نے کہا۔ ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کا کلام پڑھا اور فوٹو بھی دیکھے۔ مگر آج آپ سے مل کر بہت ہی زیادہ خوشی ہوئی۔“

تھوڑی دیر رسمی بات چیت کے بعد مجاز بولے:۔

”کہاں کام کرتے ہو بھئی آزاد؟“

”امپیریل بنک نئی دہلی میں۔“

”واہ واہ پھر تو تم میرا ایک کام کر دو گے؟“

”سر آنکھوں پر۔“

”تم شاید نہیں جانتے آزاد کہ میرا ہوٹل میں اکاؤنٹ ہے، قہوہ خانے میں اکاؤنٹ ہے، ریسٹوران میں اکاؤنٹ ہے، چائے خانوں میں اکاؤنٹ ہے۔ بس ایک اکاؤنٹ اپنے بنک میں اور کھول دو۔“

(مرسلہ آزاد بہادر پوری)

رندِ جواں مرگ کے اپنے قلم سے

آخری سالوں میں رندِ جواں مرگ نے لکھنا پڑھنا قریب قریب چھوڑ دیا تھا۔ "آوارہ" اور "خواب سحر" اور "بول اری او دھرتی بول" کی آتش بداماں تخلیقات پیش کرنے والا فنکار اپنی قلم کا نشتر زندگی کی رگ جاں پہ رکھ کر بھول گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہم مرحوم کی چند ایسی چیزیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھیں۔

ذیل میں ہم مجاز کی ایک مشہور و معروف نظم "بول اری" اور چند غیر مطبوعہ منظوم و منثور تحریریں قارئین شاہراہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بول! اری او دھرتی بول

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

بادل، بجلی، رین اندھیاری　　دُکھ کی ماری پرجا ساری
بوڑھے، بچے سب دُکھیا ہیں　　دُکھیا نر ہیں، دُکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے　　سب بنئے ہیں سب بیوپاری

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

کل جگ میں، جگ کے رکھوالے　　چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں　　نیلے، پیلے، گورے، کالے
مکھی، بھنگے، بھن بھن کرتے　　ڈھونڈتے ہیں مکڑی کے جالے

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

کیا افرنگی، کیا تاتاری　　آنکھ بچی اور برچھی ماری
کب تک جنتا کی بے چینی　　کب تک جنتا کی بے زاری
کب تک سرمائے کے دھندے　　کب تک یہ سرمایہ داری

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

نامی اور مشہور نہیں ہم — لیکن کیا مزدور نہیں ہم
دھوکا اور مزدور کو دیں — ایسے تو مجبور نہیں ہم
منزل اپنی پاؤں کے نیچے — منزل سے اب دور نہیں ہم

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

بول کہ تیرے پھل کھائے ہیں — بول کہ تیرا دودھ پیا ہے
بول کہ ہم نے حشر اٹھایا — بول کہ ہم سے حشر اٹھا ہے
بول کہ ہم سے جاگی دنیا — بول کہ ہم سے جاگی دھرتی

بول! اری او دھرتی بول،
راج سنگھاسن ڈانواڈول

مجازؔ کی عکسی تحریر

یہ شاعرِ شہرنگار کی ایک عکسی تحریر ہے۔ جو ایک مختصر سے مضمون کی شکل میں ہے۔ یہ مضمون مجازؔ نے اپنے عزیز دوست افضل پشاوری کی شاعری کے بارے میں قلم بند فرمایا تھا۔ یہ بلکہ ہسپتال جانے سے کچھ دن پہلے کی تحریر ہے۔ مرحوم نثر میں بہت کم لکھا کرتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ چھوٹا تنقیدی مضمون ایک یادگار حیثیت رکھتا ہے۔

افضل پشاوری میرے ایک جواں قسمت اور
جواں ہمت دوست ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اچھے
دوست ہیں وہ نہایت خوش گو شاعر بھی ہیں۔ میرے
ان کے پندرہ سولہ سال کے تعلقات ہیں۔ میں نے ان کو
انتہائی مصروفیت کے دور میں بھی ایک صاحب دماغ
شاعر پایا۔

ایک الگ رنگ رکھتے ہیں۔ وہ تقلید کے
قائل نہیں ہیں۔ ان کے انداز بیان میں ایک
خاص سادگی و شوخی ہے اور
ایک ایسی مخصوص بے تکلفی ہے جو کہیں اور کم ملیگی

اس دور میں جب کہ زبان کا مسئلہ اسقدر
اہم ہوگیا ہے۔ کلام کی سادگی یقیناً ایک غالب حیثیت اختیار
کر لیگی۔ افضل صاحب کچھ اپنی افتاد طبع اور کچھ
شدید مصروفیت کی بنا پر مشاعروں سے بھی الگ
تھلگ رہے اور رسائل و جرائد سے بھی گریز
کرتے رہے۔ اسی لئے وہ زیادہ متعارف نہیں۔
ان کا مجموعہ کلام جب سامنے آئیگا تو دلوں
پر یقیناً ایک گہرا نقش چھوڑیگا۔ سیدھے سادے
انداز میں بڑی بات کہنا ذرا مشکل امر ہے۔

مگر افضل صاحب کا کلام دیکھکر اندازہ ہوگا
کہ اہم سے اہم بات کس سادگی سے کہی جاسکتی
ہے۔
تخیل کی جدت و ندرت زبان کی
سادگی، سلاست، شوخی اور جرات افضل صاحب
کی شاعری کے بنیادی عناصر ہے۔ ہم امید ہے
امید ہی نہیں یقین ہے ادبی دنیا ان کے
مجموعہ کلام کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کریگی۔

مجاز

دو نظمیں تین گیت

سعید اختر نعمانی نے جو مجاز مرحوم کے عزیز رشتہ داروں میں سے ہیں، ہمیں مجاز مرحوم کے چند غیر مطبوعہ گیت اور نظمیں ارسال فرمائی ہیں۔ بقول نعمانی یہ تین گیت انھوں نے فلموں کے لئے لکھے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کونسی فلموں کے لئے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک گیت "کیسی تباہی آئی" مجاز مرحوم کے اپنے عکس تحریر میں پیش کیا جارہا ہے جو ان کی ڈائری میں سے حاصل کیا گیا ہے ——

نیا کشمیر

اِک شرارہ جھلملایا اور فضا میں کھو گیا
اک شرارہ جانبِ خلد جواں آیا تو کیا

کوئی طوفاں آئے اک کوہِ گراں ہے اس طرف
کوئی طوفاں برسرِ کوہِ گراں آیا تو کیا

دست و بازو میں صلابت آچکی فولاد کی
اب مقابل اِک حریفِ نیم جاں آیا تو کیا

خود حقیقت پر پڑے باطل کا سایہ تا بکے
مہرِ عالم تاب کے آگے دھواں آیا تو کیا

دَیر کی عظمت بھی ہے آخر مسلّم ہم نفس
دَیر کی محراب تک شمعِ راذاں آیا تو کیا

. . . .

. . . .

چند بنیادی عناصر برسرِ پیکار ہیں،
اک نئے کشمیر کی تشکیل کی آثار ہیں

کیوں؟

(نذرِ جوشؔ)

ظلمات کے پردے سے ہویدا ہو سحر کیوں
اب شکوۂ پایانِ تنگیِ دامانِ نظر کیوں

اے جوشؔ باین وضع یہ شعلے یہ شرر کیوں
جب کھو ہی دی پھر گم شدہ جنت پہ نظر کیوں

سرخیلِ سبک گام کو صرصر کی خبر کیا
اک شمعِ سرِ طور با آہنگِ دگر کیوں

ظلمت جو تری بس میں ہو تنویر کی مت سوچ
یہ تاب و تبِ چشمۂ حیواں پہ نظر کیوں

اِک سعیِ جہاں دیدہ نہ ہو نذرِ حجابات
اک لرزشِ بوسیدہ پسِ پردۂ در کیوں

پہلا گیت:-

کیسی تباہی آئی

جی بیٹھ گیا، من ہارا   اب سونا ہے جگ سارا
ہر پگ پر دکھ کے کانٹے   ہر راہ میں گھور اندھیارا
ہر سمت اداسی چھائی
کیسی تباہی آئی

—

اک جوت جگا کر پل میں   وہ چاند چھپا بادل میں
اب کوئی نہیں ہے اپنا   اس جیون کے جنگل میں
ہر سانس ہے ایک دہائی
کیسی تباہی آئی

سپنوں کے محل سب ڈھائے   آشا کے دیپ بجھائے
بپتا کی آندھی اُٹھی   دکھ درد کے بادل چھائے
آفت کی گھٹا منڈلائی
کیسی تباہی آئی

دنیا کو نہ منہ دکھلاؤں   جاؤں تو کدھر میں جاؤں
یہ دکھ کس کے بتلاؤں   یہ درد کسے سمجھاؤں
اب میں ہوں مری تنہائی
کیسی تباہی آئی

دوسرا گیت :-

(۱)

کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے
امرت رس برسائے
من کی کلی کھل جائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے
کوئی یکایک سامنے آ کر نین سے نین ملائے
اور کبھی چھپ جائے
چُپ چُپ کر جائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے
جیون کے آکاش پہ چمکے رہ رہ کر مسکائے
سُندر روشن نیارا
من میں جوت جگائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے
شوخ، سجیلا، رسیلا، چنچل چھیڑ کرے ٹر جائے
میں روٹھوں وہ منائے
بہلا کر سمجھائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے

●

تیسرا گیت :-

(۲)

آ رہی ہے نرالی بہار
جی میں جو کچھ ہے وہ کوئی کیسے کہے،
میری رگ رگ میں نس نس مدرا بہے
بج رہے ہیں خوشی کے ستار　　آ رہی ہے نرالی بہار!
میری آشاؤں نے آج پہلے پہل
حسرتوں کا بنایا ہے رنگیں محل،
کوئی کھولی ہے جس کے دوار　　آ رہی ہے نرالی بہار!
تارے ناچیں ہواؤں میں چھاگل بجے
میری دنیا سجے اور پل پل سجے
ہر طرف اک انوکھا نکھار　　آ رہی ہے نرالی بہار!
میری دنیا ہے کیا جگمگائی ہوئی!
ہر طرف زندگی مسکرائی ہوئی!
من ہے کیسی خوشی سے دو چار　　آ رہی ہے نرالی بہار!

نریش کمار شاد

احتجاج

زندگی! دیکھ چشمِ عبرت سے — اپنے دامن پہ ایک داغ نیا
دیکھ اک اور بجھ گیا ہے چراغ — دیکھ اک اور ساز ٹوٹ گیا

دیکھ اے ناقصوں کی متوالی! — دیکھ ہاں دیکھ اے ہنر دشمن
چیختے ہیں ہر اک ساز کے تار — رو رہی ہے لہو نگارِ سخن

زندگی بھر بڑے خلوص کے ساتھ — وہ رہا تھا ترا ہی دل دادہ
کھو گیا موت کے اندھیرے میں — آج جو روشنی کا شہزادہ

کھا گیا وقت اس مغنی کو — جس کے نغمے تھے مصر کے بازار
جس کی باتوں سے پھول جھڑتے تھے — جس کے اشعار پر فدا تھی بہار

جس نے تیری اندھیری راتوں میں — خونِ دل سے دیئے جلائے تھے
جب کبھی اپنا ساز اُٹھایا تھا — تیری عظمت کے گیت گائے تھے

جس نے اپنی دریدہ ہستی کا — ایک بھی چاک عمر بھر نہ سیا
تیری عریاں حقیقتوں کو مگر — شعریت کا حسیں لباس دیا

گو ترے [illegible] شراب خانے سے — صرف زہر اب ہی ملا تھا اُسے
پھر بھی اُس مستقل تغافل کا — اے ستم گار! کب گلا تھا اُسے

زندگی! تیری ناشناسی نے — ایک دانائے راز کو مارا
موت تو محض اک بہانہ ہے — ورنہ تو نے مجاز کو مارا

سلام مچھلی شہری

خطا کس کی ہے؟

(یہ نظم مجاز کے مینٹل ہسپتال بھیجے جانے کے بعد لکھی گئی ہے)

جھوم کر بزمِ علی گڑھ سے اٹھا اک شاعر
اپنی آواز میں سرمستیٔ خیام لئے
شور تھا "نغمہ گرِ محفلِ راز آتا ہے"

رقص کرتا ہوا، گاتا ہوا، لہراتا ہوا
اپنے ہمراہ نگارانِ سبک گام لئے
کہہ رہا تھا کہ "خبردار مجاز آتا ہے"

(۲)

دھلی، لاہور، علی گڑھ کی ہر اک محفل میں
شاعرِ حسن و محبت کے ترانے گونجے
ماہ پاروں کی بھی دزدیدہ نظر اٹھنے لگی

رہنماؤں میں، جوانوں میں سرِ جشنِ نو
اس کے جذبات کی دنیا کے فسانے گونجے
جاگ کر منظرِ بزمِ سحر اٹھنے لگی

(۳)

مرغزاروں میں غزالان ادھر جھوم اٹھے
کج کلاہِ ختن و مصر و تتار آ ہی گیا
اب ذرا حسن و محبت کا نظارہ ہوگا

ماہپاروں میں خوشی تھی کہ "ہمارے دم سے
اک خرابِ گل و نسرین بہار آ ہی گیا
اور بھی اوج پہ اب حسن کا تارا ہوگا

(۴)

ناقدانِ ادب و شعر میں یہ چرچا تھا
"ایک فن کار بہ اندازِ دگر آتا ہے
بزمِ اردو میں نیا ساز رواں ہونے دو"

نوجوانوں میں مسرت تھی کہ "اپنی جانب
شاعرِ وقت بصد برق و شرر آتا ہے
صفِ اعدا میں ہمیں شعلہ فشاں ہونے دو!"

(۵)

خیر مقدم کی یہ آواز فسوں ہو گئی
ایک شاعر تھا کہاں تک نہ بھٹکتا آخر
راستہ بھول گیا آہ، وہ منزل کے قریب

قلزمِ وقت میں طوفان بپا ہوتا گیا
اک کنول کیسے کھلا رہتا۔ مہکتا آخر
خود بخود ڈوب گیا آہ، وہ ساحل کے قریب

(۶)

آخری موڑ پہ بھی "ہائے غمِ دل" کہہ کر
اس نے اپنے لئے دنیا سے سہارا مانگا
اور دنیا اسے "آوارہ" سمجھتی ہی رہی

لکھنؤ، بمبئی، دلی کے شبستانوں میں
اس نے مہ پاروں سے جینے کا اشارہ مانگا

اور پھر ہوم اُسے ناکارہ سمجھتی ہی رہی

(۷)

ناقدانِ ادب، شعر کی جانب دوڑا
"یہ مرا درد، مرا غم تو سمجھتے ہوں گے"
اور نقاد بلا جان کے کترانے لگے

نوجوانوں کی طرف آیا کہ "بے شک یہ لوگ
حاصلِ کاوشِ پیہم تو سمجھتے ہوں گے
اور وہ "شاعرِ آوارہ" سے گھبرانے لگے

(۸)

زخم پر زخم کہاں تک دلِ نازک سہتا
جام پر جام چڑھانے کے سوا کیا کرتا
اب وہ مے خوار تھا، میخوار تھا، اور کچھ بھی نہیں

اپنے نغمات کے موہوم شبستانوں میں
بے سبب ناچنے، گانے کے سوا کیا کرتا
اب نہ دیوانہ تھا، بیمار تھا اور کچھ بھی نہیں

(۹)

ایک ناقد نے بڑے درد بھرے لہجے میں
قہوہ خانے میں یہ چپکے سے بتایا مجھکو
"کثرتِ مے نے بنا ہی دیا دیوانہ اُسے"

ایک "ساتھی" نے کونڈر کا دھواں لہرا کر
جیسے ایک مژدۂ جاں بخش سنایا مجھکو
سنئے ہی ڈھا چمنِ حسن کا افسانہ لئے

(۱۰)

ایک خاتون جو دلی سے ابھی آئی تھیں
مجھسے کہنے لگیں "کیا حال بتاؤں تم کو
کس طرح رہتے تھے، کیا کرتے تھے دلی میں مجاز!"

ایک شاعر نے جو کلکتے سے کل آیا تھا
مجھسے پوچھا کہ "غمِ دوست، سناؤں تم کو
وحشیانہ سے ہیں، پاگل سے ہیں اس کے انداز"

(۱۱)

آخرش ہم کو یہ غمناک خبر مل ہی گئی
شاعرِ حسن ہے "رانچی" کے شفاخانے میں
لیکن امید ہے وہ جلد ہی لوٹ آئے گا!

جیسے رانچی کی پہاڑی سے یہ آتی ہے صدا
"اب بھی کچھ ہوش ہے باقی ترے دیوانے میں
تیرا دیوانہ غمِ دہر پہ چھا جائے گا

(۱۲)

میں سمجھتا ہوں مجاز آئے گا۔ آئے گا مجاز
اور در اصل بہ اندازِ دگر آئے گا!
آنے والا ہے مرا زندۂ جاوید مجاز

میرا دل کہتا ہے اس بار سرِ مطلعِ فن
اک نئی صبح، نیا جلوہ نظر آئے گا
مسکراتا ہے پسِ پردۂ خورشید مجاز

(۱۳)

اور بالغرض اگر وہ یوں ہی بیمار رہا
میں زمانے سے یہ پوچھوں گا خطا کس کی ہے
ناقدو، راہنماؤ! تمہیں دینا ہے جواب!

جس میں شاعر کے لئے درد نہیں پیار نہیں
کس کی دنیا ہے، یہ منحوس فضا کس کی ہے
بولو! موجودہ خداؤ! تمہیں دینا ہے جواب"

(۱۴)

مسکراتا ہوا گر میرا مجاز آ نہ سکا
ایک طوفانِ جنوں خیز بپا کر دوں گا
ناقدو! تم مرے شعلوں سے نہیں بچ سکتے

ادب و شعر کے مجہول خداؤ سن لو
چمنِ فکر کے پھولوں میں شرر بھر دوں گا
تم مرے آتشیں جھونکوں سے نہیں بچ سکتے

نیاز حیدر

مجاز کی یاد میں

قلق ہوتا ہے اس کا جام خالی دیکھ کر ساقی
نہ آئے وہ مگر اس جام کو لبریز رہنے دے
کہ یادِ یار کا یہ چاند آنکھوں سے نہ ہو اوجھل
بجامِ سوزِ دل ساغر کی گردش تیز رہنے دے

بھڑکتا لالہ و شعلوں میں پیوندِ زمیں ہونا
بلا نوشوں کا تیرے یہ بھی اک اندازِ مستی ہے
تعجب کی انتہا کیا ہے سوا نو رستہ غنچوں کے
بجز آغازِ ہستی اور کیا انجامِ ہستی ہے؟

وہ متوالا مغنی جس کے نغموں کی تجلی پر
بنے دنیا کی قسمت کے ستارے ناز کرتے تھے
شگفتِ گل کا دیوانہ وہ شیدا خوبرویوں کا
وہ جس کی پیروی رندانِ شاہد باز کرتے تھے
وہ جب گاتا تو شرمیلی نظر بھی مسکرا اٹھتی
وہ جب گاتا تو ارمانوں کی دنیا جگمگا اٹھتی
ترنم جس سے سورج کی تمازت نرم ہو جاتی
کبھی شبنم کی ٹھنڈک مثل نفرت گرم ہو جاتی

وہ گاتا اور ریشم آنچلوں کے لہلہا جاتے
وہ گاتا اور وہ دل ایک دھڑکن میں سما جاتے
خزاں کی فصل میں بھی گل سرِ زرتازگی پاتے
جیالے نوجواں ہر جبرِ فولادی سے ٹکراتے
وہ ہلتے قصرِ شاہی تاج کے پتھر لرز جاتے
وہ جب گاتا تو مردوں کے دل دھڑکتے پہنچ جاتے
فراقِ یار جس دم سا تیا محسوس ہوتا ہے
قسم اس مے کی دل کو تشنگی محسوس ہوتا ہے
تری نظروں سے جاگ اٹھتا ہے کیوں اک ذوقِ مے نوشی
لبوں تک آتے آتے جام کیا محسوس ہوتا ہے

محبت کی تمنا پھر بھی شاید مضطرب رہتی
جو اس کی ناز بردار ی میں ہم جی سے گزر جاتے

نہیں ہے خون اس کا گردنِ مینا پہ اے ساقی
تری محفل سے باہر تمناؤں کی حکمرانی ہے
نہ جانے حرف آئے گی شریفوں کن رئیسوں پر
نہ مجھ سے پوچھنا کیا اس کے قاتل کی نشانی ہے
مجاز اپنے پیامِ صبح کی کلیوں میں زندہ ہے
صبوحی جیسی قسمت کے حسیں قطروں میں زندہ ہے
شفق زادوں میں رخساروں کی تابانی میں زندہ ہے
نئی چاہت کی ہر معصوم حیرانی میں زندہ ہے
تمناؤں کے خواب اور ان کی تعبیروں میں زندہ ہے
وہ آنے والے مستقبل کی تقدیروں میں زندہ ہے

بھڑکتا لالہ و شعلوں میں پیوند زمیں ہونا
بلا نوشوں کا تیرے یہ بھی اک اندازِ مستی ہے
برائے تزئینِ حسن اہتمامِ صحبتِ رنگیں
نشاط آگیں فضا پہ کیف لئے عسرت برستی ہے
طلب ہے جاوداں اور تشنگی ہے بیکراں جن کی
پہنچنے کو لبوں تک ان کے موجِ مے ترستی ہے
اگر خالی نہ ہو تیرا سبو ٹوٹے نہ پیمانہ
تو مٹ جائے وہ مشرب نام جس کا مے پرستی ہے
دلاسوں سے بھلا تسکیں کسی کی ہونے والی ہے
"بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے"
قلق ہوتا ہے اس کا جام خالی دیکھ کر ساقی
نہ آئے وہ مگر اس جام کو لبریز رہنے دے
"نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی"

ناہید رضوی

آج پھر اک خبر...

آج پھر اک خبر موت کی سا گیا!
ایک غم ایک خلش اک چبھن دے گئی
مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
گاتے گاتے غزل کوئی چپ ہو گیا
پیتے پیتے کوئی بادہ کش سو گیا
آج پھر سازِ نو کی دھڑک رک گئی
آج فن کی فضا میں گھٹن سی گئی
تیر فن کے جگر میں اتر سی گئی
بزم کی خامشی داستاں بن گئی
زندگی موت کی میزباں بن گئی
آج پھر نغمہ و شعر کی مہ لقا
اپنی پلکوں پہ موتی سجانے لگی
اپنے ماتھے سے بندیا چھڑانے لگی
اس کے خوابوں کی شہزادیاں لٹ گئیں
اس کے تخیل کی وادیاں لٹ گئیں

آج پھر لالہ رویانِ پردہ نشیں
بال کھولے خلاؤں کو تکنے لگیں
آرزوئیں دلوں میں سسکنے لگیں
عارض و لب کا مدحت سرا اٹھ گیا
وہ سراپا خلوص و وفا اٹھ گیا
آج پھر مطربِ خوش ادا، خوش نوا
ہچکیاں لے کے آنسو بہانے لگی
تیرے تاروں پہ نوحہ سنانے لگی
اس کے نغموں کا پروردگار اٹھ گیا
ایک فن کار اک حسن کار اٹھ گیا
آج پھر کاروانِ مہ و کہکشاں
سر جھکائے فضاؤں میں بہنے لگا
میری دھرتی کے ذروں سے کہنے لگا
وہ پرستارِ شمس و قمر اٹھ گیا
وہ شبِ تاب کا نامہ بر اٹھ گیا

آج پھر یوں گلستاں میں آئی صبا
لالہ و گل کی دوشیزگی ڈر گئی
ہر روش پر بہکتی کلی ڈر گئی
رنگ و بو کے حسیں قافلے تھم گئے
ڈالیوں پر حسیں چہچہے تھم گئے
وہ پرستارِ سرو و سمن اٹھ گیا
وہ نقیبِ گل و نسترن اٹھ گیا
آج پھر رات کی خوبصورت دلہن
اپنی آنکھوں کا کاجل چھڑانے لگی
چاند تاروں کی شمعیں بجھانے لگی
اس کی رنگینیوں کا نگر لٹ گیا
شاعر و مونس و ہم سفر لٹ گیا
آج پھر میکدے کی حسیں چاندنی
بادہ خواروں کی روحوں کو ڈسنے لگی
زیست کی نامرادی پہ ہنسنے لگی
اس نے پھر اک فن کار کی بھینٹ لی
اس نے پھر اک کلاکار کی بھینٹ لی
آج پھر لکھنؤ کی حسیں اپسرا
اپنے محبوب کے غم میں رونے لگی
دل کے داغوں کو اشکوں سے دھونے لگی
اس کا پیارا مجاز آج خاموش ہے
اس کا اپنا مجاز آج خاموش ہے

آج پھر اک خبر موت کی سا گیا
کتنے چہروں کی چمکوں کو جھلسا گئی
چوڑیاں کتنے ہاتھوں کی ٹھنڈا گئی
کتنی آنکھوں میں ویرانیاں چھا گئیں
کتنی کلیاں امیدوں کی کمھلا گئیں
آج پھر اک خبر موت کی سا گیا
ایک غم اک خلش اک چبھن دے گئی
مسکراتے لبوں کی ہنسی لے گئی
آج بے خواب آنکھوں کو نیند آ گئی
زندگی گوشۂ عافیت پا گئی

دانش فرازی

مجازؔ کا عالمِ جنوں

اے نگاہِ شاعرِ مجروح، اے قلبِ مجازؔ
ای اسیرِ گوشۂ زندانِ افلاس و جنوں،
اے چراغِ انجمن، ظلمت نے تجھ کو پا لیا
اپنے مُرجھائے ہوئے چہرے کی رونق بخش دے
اے گلستانِ ادب کے طائرِ شیریں نوا
تیری ہستی اک سوالِ عسرت و بے چارگی
تیری تخلیقات کو پڑھتے ہیں اربابِ وطن،
تیرے افلاس و جنوں کا ذکر زہر آلود ہے،
مانگتے ہیں تیری شیدائی، ترا خونِ جگر،
یہ تری پژمردہ صورت زیب دے سکتی نہیں
بے حسی مانندِ بحرِ بیکراں ہے آج کل،
بے تلاطم آرزو دُنیا کو کیا دے گی سکوں
اپنی زلفِ نارسا کو نوچ لے، دیوانہ وار
موتیوں میں اب بھی تل سکتی یہاں جنسِ ہُنر

انگلیوں کو زخم چھو لینے کی عادت ہے ابھی
حسرتِ نظارۂ تخریب و وحشت ہے ابھی
قوم کے ایواں میں ہے "سرو چراغاں" کی بہار
تا کہ بڑھ جائے وطن کے روئے زیبا کا نکھار
بنگلۂ شورِ سلاسل، تیری نغموں کا شباب
اور سکوتِ نطقِ اربابِ وطن، جس کا جواب
نرم صوفوں کے سہارے، دل نشیں ماحول میں
شعر و سرمستی کی محفل میں حسیں ماحول میں
کام آ سکتا ہے کس کے یہ ترا دیوانہ پن
تیرے نغمے ہیں جہاں عشرت فروزِ انجمن
جس کی تہ سے گوہرِ مقصد اُبھر سکتا نہیں
یہ جنونِ بے صدا بیدار کر سکتا نہیں!
کس کے دستِ شوق کو ہو فرصتِ مشاطگی!
تیرے گاہک ہیں مگر مصروفِ ذوقِ زرگری

یہ پرستارِ نمائش، نعرہ بازی کے نقیب
یہ تشدد کے پجاری، زر پرست و راہزن
لوٹ سکتے ہیں خزانوں کو، لٹا سکتے ہیں یہ
باعثِ دلجوئی دوشیزۂ گل پیرہن

ممتاز حسین

کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

گذشتہ پچاس سالوں میں جس تیز روی کے ساتھ زمانہ بدلتا رہا ہے اور ساتھ ہی اس کے ہمارا شعور بھی ترقی کرتا رہا ہے، اس کی مثال اس سے قبل کے زمانہ میں کم از کم اپنی قومی تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ جو تبدیلی کل تک بہت ہی سست رفتار اور غیر شعوری تھی، وہ آج تیز رفتار اور شعوری ہے۔ زمانہ نے یہ برق پائی اس لئے پائی ہے کہ ہم خود بھی بہت زیادہ گرم سفر ہیں۔ اسباب کو پر دیتے جا رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر آج ہم مستقبل زدہ، مستقبل بیں اور مستقبل ساز ہیں۔ جینے سے زیادہ جینے کی فکر میں مبتلا ہیں۔ شاید اس لئے کہ چند جینے والوں نے ہم سے نہ صرف زندگی چھین لی بلکہ جینے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ اس حقیقت کا شعور ایک مجاہدہ پیہم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس عہد میں کیسے یہ دماغ کہ ایک ہی جذبے کے غوطے میں رہے، اور موتی بکھیرے۔ ع رگِ یائے دل ہے کفِ شوق میں۔ اب وہ بات کہاں۔ یہ تو عطیہ تھا ایک بند سماج کا، ایک بظاہر نہ بدلنے والے سماج کا جو دو ہزار سال سے ایک خوابِ گراں کی طرح ایشیا کے سینے پر مسلط رہا۔ ہم نے خود فراموشی کی وہ دولت کھو دی مگر اس سے ایک بڑی دولت کی چاہت میں۔ ایک بھرپور سرمایہ اور آزاد زندگی کی دولت۔ ایک فنکار کے لئے یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اس کی کوئی متبادل صورت بھی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی بہت ہے کہ آج کا زندہ ادب صرف حسّی ہونے پر ہی فخر نہیں کر سکتا ہے تاوقتیکہ وہ حسّی عمل میں بھی تبدیل ہونے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ جدید ادب کا یہ رجحان، قدیم ادب کی بہت سی اقدار سے ٹکراتا بھی ہو۔ اس میں لاشعور سے زیادہ شعور، خواب سے زیادہ بیداری۔ افسانہ تخیّل سے زیادہ ادراکِ حقیقت راہ پاتی جا رہی ہے۔ یہ رجحان شعور، بیداری اور ادراکِ حقیقت کے غلبہ پانے کا ہے نہ کہ لاشعور، خواب اور افسانۂ تخیّل کو نفی کرنے کا ہے۔ فرد اور سوسائٹی کی کشمکش تو خیر ہر دور میں رہی ہے لیکن تجربات کے معقول ہونے اور نہ ہونے کی جو یہ کشمکش اس دور میں اُبھر آئی ہے وہ دورِ قدیم میں نسبتاً کمزور تھی۔ کیونکہ اُس وقت معقول کا تجربات میں بدلنا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر احساسات زندگی کے تنوّع، رنگا رنگی۔ لذتِ چشم و گوش میں اسیر رہنے پر مجبور رہیں تو عقل ہمیں فریبِ رنگ و بو سے بیدار بھی کرتی رہتی ہے اور یہ جتاتی رہتی ہے کہ حقیقت صرف وہی نہیں ہے جو کہ محسوس ہوتی ہے بلکہ وہ بھی ہے جو کہ معقول ہے۔ ابھی تک ہماری شاعری میں محسوس اور معقول کی یہ کشمکش جو کہ حقیقت میں صورت و معنی کی کشمکش ہے ایک وحدت میں اُبھر نہیں پائی ہے۔ شاید اس لئے کہ جو کچھ ہمارے اپنے پرانے عہد کا معقول ورثہ تھا اسے ہم نے اپنی احساسِ کمتری میں کھو دیا اور جو کچھ کہ ہم نے مغرب سے مستعار لیا اسے اچھی طرح ہضم نہ کر سکے۔ ان حالات میں ہمارے جدید ادب کو بحیثیتِ مجموعی رومانوی ہی ہونا چاہئے تھا۔ مجاز ہماری جدید شاعری سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ وہ بھی فریبِ رنگ و بو ہی کھاتے رہے، لیکن اس احساس کے ساتھ سے

مجھ کو احساسِ فریبِ رنگ چبھوتا رہا ۔۔۔ میں اگرچہ بھی فریبِ رنگ و بو کھاتا رہا

وہ شاعری کیا جس میں فریبِ رنگ و بو نہ ہو۔ لیکن مجاز کی ہوشمندی اسی میں تھی کہ وہ اس سے فریب، فریب سمجھ کر کھاتا رہا۔ مجاز کی لیرک جو بیک وقت رومانوی اور انقلابی دونوں ہی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ اس کے شعور میں دورِ حاضر کی وہ آگہی موجود تھی

جو فریبِ رنگ و بو کو سمجھتی ہے۔ اسی شعور نے اسے عرفِ عام کے رومانوی شعراء سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کا جذبۂ عشق جذبۂ انقلابی ہے اور اس کا فریبِ نظر حقیقت آشنا ہے۔ مجاز کی کوئی بھی غزل یا نظم عشق و محبت کے واردات سے متعلق ایسی نہیں ہے جس میں اس کا یہ انقلابی شعور موجود نہ ہو۔ میں نے لفظ شعور (Consciousness) استعمال کیا ہے، نہ کوئی اور لفظ۔ شعور میں اشیاء کے بدلتے ہوئے رشتوں کی آگہی ہوتی ہے نہ کہ ان کا منطقی تصور۔ اور شاعری میں شعور ہی کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ منطقی تصورات کا۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ میں مجاز کے اپنے اس ذاتی اعتراف کے باوجود ؎

سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا حسن اور عشق کے سوا کیا ہے!

اپنے کو اس خیال پر آمادہ نہ کر سکا کہ اسے عرفِ عام میں ایک رومانوی شاعر تسلیم کروں۔ بیشک وہ ایک لیریکل شاعر تھا۔ لیکن وہ ایک انقلابی لیریکل شاعر تھا۔ فیض کے الفاظ میں وہ انقلاب کا مطرب تھا اور یہ صحیح ہے کیونکہ مجاز کی بزم میں باوجود اک نشترِ زہراگیں کی کھٹک اور ایک دریدہ حزن کی کسک کے جبر سے زیادہ اختیار اور خوف سے زیادہ امید ہے۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ ایک نئے موسمِ گل کی رسالت اور اس کی حسن آفریں قوتوں کی طربیہ ہے۔ وہ جو ایک شگاف دنیا کے مزدوروں نے سرمایہ دارانہ نظام کے قلعے میں ۱۹۱۷ء میں ڈالا تھا اور ایک نئی روشنی کی پس دیوارِ احتساب جھانکی تھی، مجاز کی لیریزم میں اس نئی روشنی کی ایک شوخ کرن بھی جلوہ گر ہو کر اس کی نظر میں نشاطِ زندگی تھی نہ کہ خواب و کم و بیش اسی شوخ کرن نے جنگِ آزادی کے جلوے میں اس کے تخیل کو جلا اور اس کے تعقل کو ضیائے رنگیں بخشی۔ مجاز نے بھی انقلاب ہی کی ایک شمع جلائی لیکن محسوسات کے فانوس میں نہ کہ اس سے باہر۔ جو لفظ بھی اس کی نوکِ زباں سے ٹپکا وہ موجِ رنگ و بو سے پر افشاں رہا۔ جو نغمہ بھی اس کی شاخِ دل سے پھوٹا وہ ایک سیلِ نور میں غلطاں۔ ظاہر بیں نگاہیں دعوتِ نظر میں کھو گئیں اور اس کی دعوتِ فکر کو بھول گئیں۔ مجاز کے ساتھ یہ ناانصافی اکثر ہوئی ہے گو مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کی شاعری میں دعوتِ فکر کم ہے۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ وہ ایک بڑا مفکر تھا۔ وہ تو صرف اس راہ کا ایک مسافرِ شب تھا رہا نہ رہا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنی گرم روی سے کہکشاں کو گردِ راہ کر گیا ؎

نہ ہم آہنگِ مسیحا نہ حریفِ جبریل، تیرا شاعر کہ ہے زندانیٔ گیسوئے جمیل

مگر وہ زندانیٔ گیسوئے جمیل، مذاقِ زندگی کا ناقد بھی تھا۔ کیا ہوا اگر کسی نے اس کو اپنی بزم سے اٹھا دیا وہ اپنا مذاقِ زیست تو چھوڑ گیا۔ اور یہ اسی مذاقِ زیست کی تلخ کامی کا نتیجہ تھا کہ جب اس نے احساسِ جمال کو اس نظامِ کہن میں جاں کنی کے عالم میں پایا اور زندگی کو انسانیت کے رشتوں سے عاری دیکھا تو پھر اس نے کسی فریادی کا نہیں ایک مجاہد کا جامہ زیب تن کر کے تیغ کو بوسہ اور ساتھیوں کو اذنِ خرام بھی دیا ؎

بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر

وہی زندانیٔ گیسوئے جمیل گناہِ عشق کے ایک جلاوطن کو اس کی واپسی پر دعوتِ شمشیر بھی دیتا ہے۔ کیا یہ نکتہ مزید اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے کہ وہ قتیلِ شیوۂ دلبری اصل میں انقلابی تھا۔ اس نے شمشیر کی آبداری اور ساز کے آہنگ کو ایک ہی آئینے میں سمو رکھا تھا۔ یہی اس کا سحر و اعجاز تھا۔ تبھی تو وہ آنچل سے بھی پرچم بنا لیتا تھا۔

جب تک ساغرِ مئے زیست سے لبریز ہاتھوں ہاتھ ہو یہ زندگی فطرت کا نغمہ اور سچائی کا آئینہ ہے لیکن جب ہاتھوں ہاتھ کاسۂ گدائی ہو اور ظالم کا میخانہ خونِ استحصال سے مالا مال ہو تو پھر یہ زندگی دکھ درد کا کارخانہ یا پھر منفی ردِ عمل میں مایا کا جنجال اور گورکھ دھندا ہونے کا حیرت خانہ ہے۔ ہاشمی میں اسی منفی ردِ عمل نے ہم سے قوتِ پیکار چھین لی تھی۔ تلوار کی جگہ تکرار اور زندگی کی جگہ کتاب ہو گئی تھی۔ مجاز ہماری شاعری میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے تکرار کو تلوار اور کتاب کو زندگی سے بدل دیا۔ شیخ و برہمن کانپے۔ محتسب چونکا لیکن وہ اندھیری رات کا مسافرِ خواب سحر دیکھ گیا اور دکھلا گیا۔ ع جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اس طرف دیکھا تو ہے!

مجاز نفسیں معنوں میں انقلاب کا صرف راہی ہی نہیں بلکہ انقلاب کا رہبر بھی تھا۔ لیکن اس کے انقلابی شعور کی سطح روشِ عام کے مطابق سطحی تھی۔ وہی نوجوانوں سے خطاب کرنے کا رنگ اور وہی قدیم خطابت۔ اس اعتبار سے مجاز کی وہ شاعری وقیع نہیں ہے۔ تاہم

اس کی شاعری میں وہ شعریت موجود ہے جو سوز و گداز، لطفِ بیان، الفاظ کے رقص اور موسیقی سے عبارت ہے۔ مجاز کا کلام شستہ ہے، بے داغ ہے۔ تمام تر مانجھا ہوا ہے، تاہم بے داغ ہے۔ وہ جو ہماری شاعری کا ایک نیا دلکش فارسی کی دلآویز ترکیبوں سے ڈھل کر ٹکسالی اردو کا لکھنؤ سے اُبھرا تھا اس کا نہایت حسین اور جاندار نمونہ مجاز کی شاعری میں ہے۔ ایسا اچھا نمونہ کہ ہر ایک کو رشک کرتے پایا ہے۔ مگر مجاز نے اردو شاعری کو اردو زبان کا ٹکسال بننے سے بچا بھی لیا۔ وہی کہا جسے احساسات نے اس کی پلکوں پر چن دیا۔ یا پھر لوک زبان پر لا کر رکھ دیا۔ اس کا ہر خیال اپنا ہے۔ اس میں زیادہ گہرائی نہ سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ اس نے اپنی بات کہی اور شاعرانہ انداز میں کہی۔

حالی کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک ہمارے قومی اور ملی شاعر کے معتد بہ حصے میں جو ایک قسم کی اُکتا دینے والی خطابت پیدا ہو گئی تھی، مجاز اس رجحان کا ایک شاعرانہ ردِ عمل بھی تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں نہ تو غیرتِ قومی کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی اور نہ ترنم کے جذبے کو۔ بلکہ اس کے برعکس اظہارِ نفس کو راہ دی۔ زخمہائے جگر کو ابھارا۔ اس نغمے کو زندہ کیا جو کہ شاعری کا جسد ہوتا ہے۔ اس لطافت کو پیدا کیا جو کہ تزئین و آرائش کے درجے سے گھٹ کر صرف سلیقہ مندی کی حامل ہوتی ہے۔ کہیں کہیں اس کی اس سلیقہ مندی میں خلل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ "اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں"۔ "آنکھوں کی مستی، اہینگی نہ سستی"۔ لیکن بحیثیت مجموعی لطافت قائم رہتی ہے۔ مجاز اپنے اس دلکشن میں ماضی کی روایات سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ پرانے الفاظ کو نئے معنی دیتا ہے اور نئی تشبیہات و استعارات بھی لاتا جاتا ہے اس لئے اس کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ؎

ہٹ کر چلے ہیں رہگذرِ کارواں سے ہم

جدید غزل میں جو انقلابی بانکپن آیا ہے نہ کہ اور چیزیں اس کی بنیاد مجاز ہی نے رکھی ہے۔ میرے اس خیال سے شاید کچھ لوگ متفق نہ ہوں، لیکن اول تو یہ کہ مجاز نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، دوئم یہ کہ انقلابی بانکپن کے ساتھ مجاز سے بہتر غزل کہنے والے شعرا موجود ہیں۔ لیکن وہ لوگ ضرور اتفاق کریں گے جو پندرہ بیس سال سے دورِ حاضر کے ادب کے ساتھ جیتے رہے ہیں۔ خیر اس پر ان کا اتفاق نہ سہی وہ اس پر تو اتفاق کریں گے ہی کہ مجاز سے پہلے نظم اور غزل دو قسم کی شاعری تھی۔ مجاز کے بعد ان کا فرق صرف اصنافِ سخن کا رہ گیا نہ کہ اقسام کا۔ اشارہ داخلیت اور موسیقیت کی طرف ہے نہ کہ تسلسل گوئی کی طرف۔

مجاز کا اسلوب منفرد بھی ہے اور بے داغ بھی۔ اس میں ذہانت بھی ہے اور شعریت بھی۔ تاہم ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مجاز کی پیروی بجز جمال کے اور کسی نے نہ کی۔ کیا اس لئے کہ مجاز نے اپنی آواز کو نہ پایا جو کہ بقولِ فراقؔ مر مر کر حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ مجاز کے یہاں فکر کی چاشنی۔ یعنی ذہنی تصویروں پر تجریدی طریق کار کی کمی ہے۔ وہ تشبیہات زیادہ اور استعارات بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں فرق تھوڑا ہی سا ہے۔ ان کی ذہانت فقروں کو لپکانے کی ہے نہ کہ خیالات کے مرتکز کرنے اور تغرد میں یونیورسل کو دریافت کرنے کی۔ اس کا ایک دوسرا سبب یہ ہے جو کہ نسبتاً کم اہم ہے کہ وہ گذشتہ دس سال سے خاموش رہا۔ مجاز بھی شاعری کے میدان میں کوہکن ہی تھا لیکن وہ اپنے تیشہ کو بہت جلد توڑ بیٹھا۔ ؏ شاید جگر کا کام تمامی کو کھنچ گیا۔

یہ ایک درسِ عبرت بھی ہے اور مقامِ افسوس بھی۔

اس وقت سے مجاز موت کی آرزو میں نہیں بلکہ موت کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ آج جس کا ہم ماتم کر رہے ہیں وہ اپنا الوداع پہلے ہی لکھ چکا تھا ؎

کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور گیا	کیوں بدگماں ہوں یوسفِ کنعانِ لکھنؤ
اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجازؔ	ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

آخر کار موت نے اس کو ہم سے چھین ہی لیا اور زندگی اپنا ساز بجروا مجاز سب کچھ لئے اس کے انتظار میں بیٹھی ہی رہ گئی۔ ؏ کیا جنوں کر گیا شعور کہ وہ — آیئے آج اس کے غم میں ہم اس جھنڈے کو سرنگوں کر لیں جسے ہم ترقی پسندی کا پرچم کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک ترقی پسند شاعر تھا بلکہ اس لئے کہ اس پرچم کو اسی نے سب سے پہلے لہرایا تھا۔

دیویندر اِسّر

موت اور تخلیقی عمل

کسی بھی ادیب اور فنکار کی موت سے ذاتی غم کا احساس ہوتا ہے اور کسی بڑے اور ذی حس ادیب کی موت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو شاید اب کبھی پُر نہ ہو سکے۔ خیر خلا تو پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھرپور پن نصیب نہ ہو جو مرحوم ادیب کی تخلیقات کے باعث ادب کو میسر تھا۔ لیکن کچھ ادیبوں کی جسمانی موت سے پیشتر بھی ان کی تخلیقی موت (اور کبھی کبھی ذہنی موت بھی) واقع ہو جاتی ہے۔ اس لئے جہاں تک تو ادب کا سوال ہے لیے ادیب کی جسمانی موت کوئی سانحہ نہیں، لیکن ادبی اور ذاتی رشتوں کے باعث صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ ان حالات میں اس صدمہ کو ادبی خلا سے تعبیر کرنا مروت تو ہو سکتی ہے لیکن حقیقت نہیں۔ ادبی مسئلہ تو تب ہی پیدا ہوتا ہے جبکہ تخلیقی کام میں سرگرم کسی ادیب کی موت واقع ہو جاتی ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب اُس کی تخلیقی سرگرمیاں ادب میں نئے اور بیش بہا اضافے کر رہی ہوں۔

ظاہر ہے کہ بڑے ادیب کی موت پر رسمی اظہارِ افسوس کے علاوہ اس کی شخصیت اور فن پر گوناگوں پہلوؤں سے روشنی ڈالی جائے گی۔ جس میں فنی، نفسیاتی اور سماجی نقطۂ نظر پیش کئے جائیں گے۔ جہاں تک رسمی اظہارِ افسوس کا تعلق ہے مرحوم کی شخصیت کو دلآویز اور بلند شخصیت کے روپ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی شخصیت واقعی بلند پایہ تھی یا اس میں وہ نقائص موجود تھے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ادنیٰ اور معمولی انسان بھی ہو سکتا ہے (ادنیٰ انسان بھی بڑا ادیب ہو سکتا ہے) لیکن تہذیب اور اخلاق کا تقاضہ ہے کہ مرحوم کی شخصیت اور کمزوریوں کا جواز پیش کیا جائے یا اُسے خوبیوں کے روپ میں بدل کر بیان کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقع بھی نہیں ہوتا کہ مرحوم کی صحیح شخصیت کو بیان کیا جائے یا اس کی ذاتی کمزوریوں کا ذکر کیا جائے یا تجزیہ کیا جائے۔ اس لئے پڑھنے والوں کو اسے رسمی اظہارِ افسوس ہی سمجھنا چاہئے۔ لیکن جب شخصیت بھی بلند ہو اور ادیب بحیثیت انسان بھی عظیم ہو تو رسمی اظہارِ افسوس حقیقت بن جاتا ہے اور امپریشن دیتا ہے۔

جہاں تک مرحوم ادیب کے فن کا تعلق ہے اسے مختلف النوع نظریات کی روشنی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے تخلیقی محرکات اور عمل کا تجزیہ کر کے مرحوم ادیب کی فنی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نقاد کے لئے لازم ہے کہ وہ مرحوم ادیب کی تخلیقات کے جمالیاتی عنصر اور اقدارِ حیات کو واضح کرے۔ تنقید کیسے لکھی گئی ہے، یہ نقاد کے نقطۂ نظر پر منحصر ہے جس پر یہاں بحث مقصود نہیں۔ لیکن جو نقاد مرحوم کے تخلیقی محرکات اور عمل کی تفسیر کرنے کے بجائے "معاشی معاشری" تک ہی رہ جاتے ہیں وہ مرحوم ادیب کی شخصیت اس کی تخلیقات اور ادب میں اس کے مقام کی اہمیت کے نادان دوست ہوتے ہیں۔ ادیب یا شاعر کی موت نقاد پر یہ فرض عائد نہیں کر دیتی کہ وہ مرحوم کی فنی کمزوریوں کو نظر انداز کر دے۔

اسی طرح مرحوم ادیب کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی اور اس کی نشوونما کے نفسیاتی تجزئے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی سوانح حیات

اور یادوں کے علاوہ نفسیاتی تجزیہ ادبی تنقید کے لئے اشد ضروری ہے۔ یہ سچ ہے کہ تنقید اس کی تخلیقات پر ہوگی۔ لیکن تخلیقات کی روح تک پہنچنے کے لئے مرحوم ادیب کی روح تک پہنچنا ضروری ہے۔ اس تجزیے سے ہم مرحوم کی زندگی کے خارجی محرکات اور داخلی میلانات کے باہمی عمل سے مرتب شخصیت سے پروردہ اس کی تخلیقات کا مقام معین کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی چیزیں بھی لکھی جائیں گی جس میں سے یہ سب غائب ہوگا۔ اور اس کے مقام پر مرحوم کی زندگی سے متعلق چند مزیدار باتیں، چٹخارے، چٹکلے، چست فقرے، لاابالی پن، آوارگی، رومانٹک موڈ، ذاتی کمزوریوں کا جواز اور اس کے ([illegible]) ہونے کا ذکر ہوگا۔ اور پڑھنے والے اس سے رس لیں گے۔ حالانکہ نقاد جذباتیت کی چالاک سطحی تحریروں سے متاثر ہونے کے بجائے سنجیدگی سے اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی اور اس کے نشوونما جاننے کی کوشش کرے گا۔ رومانٹک موڈ، شاید رومانی افسردگی کی کیفیت ہو، آوارگی کسی ذہنی بوہیمین ازم کا روپ ہو۔ بہرحال نقاد کی دلچسپی مرحوم کی شخصیت میں اس لئے ہے کہ وہ اس کی تخلیقی موت اور نگارشات پر اس کا اثر واضح کر سکے۔

لیکن ادیب کی موت پر عام طور پر یہ رائے دے دی جاتی ہے کہ "جس عالم پریشانی و افلاس میں اُس کی موت واقع ہوئی ہے اس سماج کو بدلا جائے جو اس کی موت کی ذمہ دار ہے" بہت ممکن ہے کہ کوئی ادیب عالم پریشانی اور افلاس میں مرا ہو اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ موجودہ غیر منظم اور پسماندہ سماج میں ادیب کی موت کی تمام تر یا بیشتر ذمہ داری نہ بہت مناسب ہو۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مرحوم ادیب کی قبل از موت اس کی کچھ ایسی عادات کے باعث ہو جو آخر کار متوقع موت سے پہلے ہی ادیب کو موت سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ اس میں سماج کا دخل بہت کم ہے اور نہیں بھی ہے۔ مثال کے طور پر کوئی ادیب ورثے یا ماحول یا دونوں کے باعث کثرتِ شراب نوشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا اپنی کچھ نفسیاتی مجبوریوں کے باعث اس میں پناہ ڈھونڈھتا ہے۔ کبھی کبھی یہ رشتہ بدل بھی جاتا ہے کہ الکوحل ازم نفسیاتی مجبوریوں کو جنم دے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تخلیقی قوت بھی کھو بیٹھے۔ یہ نفسیاتی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اگر میری ذاتی رائے لی جائے تو میں ادیب کی موت کے اس پہلو پر لکھنے سے گریز کروں گا لیکن اگر کوئی اور نقاد اپنے موجودہ سیاسی خیالات یا سطحیت یا جذباتیت کے باعث کسی ادیب یا شاعر کی موت سے سرمایہ بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر بحث ضرور ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ ایک ادیب کی موت واقع ہوئی ہے اور ادیب ہونے کے ناطے اس پر لکھنا ضروری ہے، بلکہ جب سماج کا ذکر آیا ہے تو سماجی فرد ہونے کے ناطے تو لیا جا سکتا ہے کہ ثابت کیجئے کہ اس کی موت کی ذمہ داری سماج پر ہے۔ اس کی اپنی کوئی انفرادی ذمہ داری نہیں۔ خیر یہ مسئلہ تو بہت پیچیدہ اور اہم ہے کہ ارادے کی آزادی اور جبریت Free will and determinism کا کیا باہمی تعلق ہے؟ لیکن اگر نقاد غیر ذمہ داری سے سماجیات، نفسیات، اخلاقیات اور فلسفہ کی سنجیدگی ملحوظِ خاطر رکھے بغیر سماج کو خواہ مخواہ گھسیٹ لائیں گے تو بحث نہ صرف ناگزیر ہو جائے گی بلکہ ایسے نازک موقع پر ناگوار بھی ہوگی۔ کیونکہ سماج کے افراد کو بھی پوچھنے کا حق ہے کہ ایک تہذیب یافتہ سماج میں ادیب کی اخلاقی بے راہ روی کہاں تک جائز ہے؟ کیا ادیب ہونے کے ناطے سے یہ لائسنس دیا جا سکتا ہے؟ سماج اور قانون یہ لائسنس دینے کے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوں گے۔ لیکن میں ادیب کو یہ لائسنس دینے کو بھی تیار ہوں اس لئے کہ اس کی تخلیقات سے جن اقدار کی پرورش ہوتی ہے وہ انسانی عظمت اور سماجی ترقی کی نقیب ہیں۔ ادبی تواریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ پست کردار انسان بلند ادیب کا رتبہ حاصل کر لیتے ہیں (حالانکہ میری خواہش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ بلند کردار انسان اور بلند پایہ ادیب لازم و ملزوم ہوں، کیونکہ اس سے ادب اپنی حدوں سے پرے کلچر کا حصہ بن جاتا ہے) میں نے اس مسئلہ کو سماجی، قانونی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے جانچنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس سارے سوال کو تخلیقی نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا کثرتِ شراب نوشی کسی ادیب کے لئے تخلیقی محرک ثابت ہوتی ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس کے باعث قبل از وقت موت کے صدمے کو برداشت کرنا پڑے گا۔ بصورت دیگر ادیب شاید زیادہ عرصہ تک زندہ رہے لیکن تخلیقی طور پر اس کی موت واقع ہو جائے۔ پہلی صورت میں ادیب کی یہ خودکشی، قربانی کے مترادف ہے چاہے یہ عادت اس کی مجبوری ہی بن چکی ہو۔ لیکن اگر یہ عادت اس کی تخلیقی قوت کو چھین لیتی ہے تو پھر ادیب کا لائسنس بھی چھن جانا چاہئے اور سماجی گرفت مضبوط ہو جانی چاہئے اور نقادوں کو بھی اس نظر سے پرکھ کرنی چاہئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ادیب کی زندگی کا ایک ہی آدرش ہے تخلیق۔ جو چیز بھی اس کی تخلیق کے لئے لازمی ہے، وہ سماجی، قانونی یا اخلاقی نقطۂ نظر سے قابلِ گرفت ہی کیوں نہ ہو سماج کو اُسے برداشت کرنے کی جرأت اور صلاحیت پیدا کرنی چاہئے۔ لیکن اگر کوئی چیز اس کی تخلیقی قوت کو شل کرتی ہے (اور اس کے ساتھ اس کی جسمانی شکست بھی جاری رہتی ہے) تو اس نے تخلیق کے فرضِ منصبی سے غداری کی ہے۔ آج کل تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ یارانِ نکتہ داں کی محفل میں جامِ ارغوانی کے نئے قطرہ قطرہ خون ٹپکایا جاتا ہے اور جامِ شہادت مفت میں ہاتھ آتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ شراب یا کوئی ڈرگ جادو ہے جس سے تخلیقی قوت حرکت میں آجاتی ہے یہ تو conditional Reflex کا معاملہ ہے۔ تخلیق کی اندرونی لگن اور قوت کا ہونا ضروری ہے۔ خیر یہ سلسلہ درمیان میں آہی گیا تو بات بھی ہوگئی۔ کچھ بھی ہو کوئی بھی وجہ ہو یہ کیا کم صدمہ ہے کہ ایک پیاری شخصیت دنیا سے چھن گئی۔ ایک خالص ادیب دنیا سے چلا گیا۔ ادیب کی موت کا بھی تاثر ہونا چاہئے۔

ادیب کی موت پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام لینے کے بجائے یہ کہہ دینے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ادیب کی موت سے تخلیقی سرگرمیوں پر کوئی اثر پڑا یا کوئی اثر نہیں پڑا۔ کیونکہ ادیب کی موت سے پہلے اس کے تخلیقی سوتے خشک ہو چکے تھے (ویسے بھی اس خواہش پرستی پر کوئی اعتراض نہیں کہ اگر وہ زندہ رہتا تو دُنیائے ادب میں ——————")

زندگی کا مسئلہ بھی میں نے اسی لئے چھیڑا کہ تخلیقی عمل پر اس کے اثر کو دیکھا جا سکے۔ میرا مدعا نہ طبی مشورہ ہے اور نہ اخلاقی درس۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بہت سے لوگوں کو ناگوار گذرے گا اور ان کے روایتی جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن سستی جذباتیت اور کھوکھلی انسانیت پرستی اور جھوٹی ادب نوازی سے پرے اور لکھنے والوں کی تخلیقی قوت کو گمراہ کرنے کے بجائے ان کی تخلیقی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے خیال سے اس کرب انگیز عمل سے گذرنا اخلاقی، سماجی اور فنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ بلند پایہ فنی تخلیق کو بھی ادیب کی انفرادی، اخلاقی اور سماجی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ تخلیقی ادب میں سرگرم ادیب کی موت ایک سانحہ ہے۔ لیکن جس ادیب کی تخلیقی قوت اس کی زندگی میں ختم ہو چکی ہو اس کی موت ایک ذاتی اور جذباتی صدمہ ہے۔ سب باتیں ثانوی اہمیت رکھتی ہیں بجز اس ایک سوال کے جو ایک ادیب کی موت میرے ذہن میں پیدا کرتی ہے کہ کہیں ادیب اپنی موت کی حدوں سے پرے اپنی تخلیقات سے "حیاتِ بعد از موت" حاصل کر کے لازوال ہو گیا ہے، یا وہ واقعی مر گیا ہے۔

وادیٔ حُسن

غالباً تین سال پہلے کی بات ہے کہ مجاز اور فراق صاحب کشمیر گئے ہوئے تھے۔ وادیٔ کشمیر کے مناظر دیکھ دیکھ کر فراق صاحب پر وجدانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ انھوں نے ان مناظر کی داد کی تائید کے لئے کچھ کہا۔

"مجاز نے ذرا غور سے وادی کے چاروں طرف دیکھا اور بولے۔ "بھئی اچھے تو مجھے لگتے ہیں، مگر ایک بڑی الجھن ہوتی ہے۔ جب کوئی حسین منظر نظر آتا ہے تو ایک کرخت سا پہاڑ اس کے سامنے حائل ہو جاتا ہے۔"

(مرسلہ اظہر پرویز)

محل اور جھونپڑے

دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں ایک لکھنوی پروفیسر خالص انگریزی لب و لہجہ میں تقریر کر رہے تھے اور مجاز دُنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ پروفیسر نے اپنی تقریر کے دوران میں ہی رُکتے ہوئے پوچھا۔ "کہیے مجاز صاحب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"—— مجاز نے برجستہ جواب دیا۔ "کچھ نہیں بس یہی سوچ رہا تھا کہ کیا انقلاب ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد جھونپڑوں میں رہتے ہوئے محلوں کے خواب دیکھتے تھے اور ایک آپ ہیں کہ محلوں میں بیٹھ کر جھونپڑوں کا خواب دیکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب آپ اپنی تقریر جاری رکھیے۔"

(مرسلہ اظہر پرویز)

فکر تونسوی

مجاز کی ایک نظم

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے   زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے
زندگی، خاک و خون میں تھڑی   آنکھ میں شعلہ ہائے تند لیے
دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی   رقص فرما ہے روحِ بربادی
بربریت کے کاروانوں سے   زلزلے میں ہے سینۂ گیتی
ذوقِ پنہاں کو کامراں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک پیمانۂ مئے سرجوش   لطفِ گفتار، گرمیٔ آغوش
بوسے۔ اس درجہ آتشیں بوسے   پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش
روح یخ بستہ ہے تپاں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار   پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے   آگ برسائیں گے لبِ گفتار
کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

پھر کہاں یہ حسین سہانی رات   یہ فراغت یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں   کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات
آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

مجاز کی یہ نظم "مہمان" اُن لمحوں کی کہانی بیان کرتی ہے جب کہ رات حسین اور سہانی ہے اور اس حسین اور سہانی رات میں دو کردار ہیں یہ دو کردار کون ہیں؟ کیا اُن میں ایک شاعر ہے اور ایک اس کی محبوبہ ہے؟ اور شاعر کسی سفر کی تیاری کر رہا ہے؟ نظم کی اُٹھان ہی سے پتہ چل جاتا ہے

کہ شاعر کو کوئی خاک و خون میں لتھڑا ہوا سفر درپیش ہے جس کی کئی شدید و تیز تصویریں اس کے ذہن کے پردہ پر ابھر رہی ہیں۔ یہ تصویریں نظم کے ہر بند میں تند زور انداز میں دراتی ہوئی گھس آتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب شاعر ان بھیانک تصویروں سے دامن بچا کر محبوبہ کی آغوش کی گرمی میں پہنچتا ہے تو اس کا لب و لہجہ لطیف اور نازک نہیں رہتا بلکہ وہاں بھی اس کے الفاظ میں تندی اور سختی سی آ جاتی ہے۔ مثلاً جب وہ محبوبہ کے بوسہ کی تصویر بناتا ہے تو اس بوسہ میں بھی وہی آنے والے سفر کی بادِ سموم سی چلتی ہوئی محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے :۔

بوسے ۔ اس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش

یہ دو مصرعے پڑھ کر ہمارا ذہن بوسے کی حلاوت اور شیرینی اور تلذذ میں نہیں ڈوب جاتا بلکہ فوراً دوسرے بند کے اس پہلے شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے :۔

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے روحِ بربادی

تو کیا یہ سموم وہی ہے جو شاعر کے آنے والے سفر میں چلے گی؟ اور جو سفر کرنے سے پہلے ہی اس کی محبوبہ کے بوسہ کو جلا رہی ہے اور اس کی اپنی کشتِ ہوش کو پھونکے دیتی ہے۔ یہ آگ محبوبہ کے بوسہ کی نرمی اور صباحت میں کیونکر بھڑک اٹھی ہے۔ نظم پڑھتے پڑھتے اچانک ذہن کی سطح پر ایک ننھا سا خیال ابھرتا ہے کہ اصل میں وہ بوسہ آتشیں نہیں ہے بلکہ خود شاعر کا شعور آتشیں ہے۔ اُس کے اپنے جذبات چھلک رہے ہیں۔ یہ اُس کے نہاں خانۂ تصور کی آگ ہے جس کا اعتراف وہ نظم کے آخری بند میں جا کر کرتا ہے۔ اور جیسے ایک سوالیہ سی چیخ میں اپنے نہاں خانہ کا راز کھول دیتا ہے اور کہتا ہے :۔

کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات

اور جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ یہ شورشِ جذبات، یہ ذوقِ نہاں کی نا آسودگی اُس کی رومانوی اور جنسی تشنگی کا ہی اظہار نہیں کرتی بلکہ اس رومانوی تشنگی کے ڈانڈے بربریت کے اُن قافلوں سے مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ؎

زلزلے میں ہے سینۂ گیتی

اور سینۂ گیتی کا یہ زلزلہ اور شاعر کی رومانوی تشنگی سے پیدا ہونے والی شورشِ جذبات دونوں ایک دوسرے کے عکس بن جاتے ہیں اور یوں دو مختلف سمتوں میں چلنے والی لہریں بار بار ایک ہی مرکزی نقطہ پر جا کر مل جاتی ہیں اور شاعر کی متواتر کوششیں بھی انھیں الگ الگ نہیں رکھ سکتیں۔ بار بار یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر سینۂ گیتی کے زلزلہ سے بھاگ کر چند لمحوں کے لئے پیمانۂ مے میں پناہ لے رہا ہے۔ مگر پیمانۂ مے میں بھی ایک زلزلہ سا آ رہا ہے اور مے میں بھی زلزلہ کی سی رفتار اور دھمک محسوس ہو رہی ہے۔ مے بھی تسکین اور آسودگی کے اسباب مہیا نہیں کرتی (جو شاعر کا لمحاتی مقصد ہے) بلکہ ایک تند و تیز "مے پرجوش" بن جاتی ہے۔ ایک ابلتی ہوئی مے کا پیمانہ۔ ایسا پیمانہ جس کی آنکھوں میں سے تند خو شعلے نکل رہے ہیں اور جو شاعر کی کشتِ ہوش کو جلا رہے ہیں۔

مگر اس سے بھی بات صاف نہیں ہوتی۔ یہ تند خو شعلے کیوں نکل رہے ہیں، یہ پیمانہ کس چیز کا اشارہ ہے۔ یہ شاعر کون ہے، اس کی محبوبہ کون ہے؟ اور یہ رات ان دونوں کرداروں پر کیسے اُتری ہے۔ کب اُتری ہے۔ کیوں اُتری ہے؟

ان سبھی سوالوں کو حل کئے بغیر نظم کی کئی پیچیدہ گرہیں نہیں کھل سکیں گی۔ بلکہ یہ کہانی ہر بند میں بدستور جگہ جگہ جھٹکے کھاتی رہے گی۔ ایک بات تو صاف ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔ ہم تخیل کی آنکھ سے اُس منظر کی تصویر بنا سکتے ہیں جس میں ایک کمرہ ہے۔ تنہائی ہے، شاعر ہے، اس کی محبوبہ ہے، ساغرِ مے ہے اور رات حسین ہے اور سہانی ہے۔ مگر یہ رات کوئی عام سی رات نہیں ہے بلکہ اس رات

کی کچھ اپنی منفرد خصوصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ رات دریا کے دو طوفانی کناروں کے درمیان ایک حسین سے پل کا کام دیتی ہے۔ یہ ان لمحوں کی رات ہے جس کے آگے اور پیچھے طوفان منہ پھاڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ رات کے ان لمحوں کو ہم لمحات غنیمت کہہ سکتے ہیں۔ اور شاعر پوری شادمانی سے ان لمحات سے لذت اخذ کرنا چاہتا ہے۔ اس شادمانی کی خواہش کا علم ہمیں پہلے بند کے آخری مصرعہ سے چلتا ہے کہ

"دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں"

مگر یہ سوال بدستور اُبھر کر ہمارے سامنے لہراتا رہتا ہے کہ شاعر کس قسم کے سفر پر جا رہا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ رات سفر سے پہلے کی رات ہے۔ اگرچہ ٹیپ کا مصرعہ "آج کی رات اور باقی ہے" ہمیں برابر اس الجھن میں رکھتا ہے کہ اس سے پہلے کی راتوں میں شاعر پر کیا گذرتی رہی ہوگی۔ کیا وہ تمام راتیں بھی آج کی رات کی طرح حسین اور سہانی تھیں یا کیا اُن میں بھی شورش جذبات کی یہی کیفیت تھی؟ ممکن ہے ایسا ہی ہو اور ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ کیونکہ بظاہر تو یہ رات ان بہت سی راتوں کا ایک آخری نقطہ دکھائی دیتی ہے جن میں شاعر اور اس کی محبوبہ کی قربت ایک زنجیر کی طرح کڑیاں بناتی چلی گئی ہے۔ لیکن آج وہ زنجیر اپنی آخری کڑی تک آ پہنچی ہے۔ جبکہ اس کے آگے قربت کی کوئی کڑی نہیں آئے گی بلکہ جدائی کی ایک لمبی صبح کا آغاز ہو جائے گا اور شاعر قربت حُسن کی اس زنجیر سے کٹ کر کہیں سفر پر چل دے گا۔

لیکن فی الحال ہم بہت سی راتوں کی الجھن کو الجھن ہی رہنے دیتے ہیں کیونکہ الجھن کا تعلق بھی اس سفر کی منفرد نوعیت سے ہے اور سفر کی نوعیت ہمیں نظم کے کئی مصرعوں سے نمایاں ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ہم نظم کے مختلف مصرعوں میں کئی الفاظ ایسے پاتے ہیں جو اس سفر کے رنگ روپ کو بار بار جھلکاتے ہیں۔ ہم ان الفاظ کی بھی ایک بالترتیب زنجیر سی بنی ہوئی دیکھتے ہیں منہ پھاڑے کھڑی ہوئی زندگی۔ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی۔ شعلہ ہائے تند لٹے ہوئے آنکھیں۔ جلتی ہوئی بادِ سموم۔ روحِ بربادی کا رقص۔ بربریت کے کارواں۔ سینۂ گیتی کا زلزلہ۔ ساز زیست کا چھڑنا۔ لبِ گفتار کی آگ۔ یخ بستہ روح ——— یہ صرف الفاظ اور ترکیبیں ہی نہیں ہیں بلکہ یہ شاعر کے اس سفر کی مختلف منزلیں ہیں۔ اس کے مختلف نقوش۔ اس کے مختلف عمل۔

ظاہر ہے کہ سفر نہایت کڑا ہے۔ اس میں آگ آتی ہے۔ زلزلہ آتا ہے۔ خاک و خون آتا ہے۔ تباہی و بربادی آتی ہے۔ یہ تند و تیز علامتیں کسی ایسی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو کسی جنگ میں مبتلا ہے۔ اور شاعر کے عزم سفر میں جو موڈ ہمیں دکھائی دیتا ہے اس سے بھی کسی آنے والی جنگ کی تصدیق ہوتی ہے اور یہاں پہنچکر ہمیں شاعر ایک مجاہد سپاہی کے روپ میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ جسے کل صبح میدان جنگ کی طرف کوچ کرنا ہے۔ طبل جنگ پر چوٹ پڑ چکی ہے۔ زندگی میں دو طاقتیں باہم متصادم ہونے کا اعلان کر چکی ہیں۔ اور شاعر ان میں سے ایک طاقت کا نمائندہ بن کر جنگ میں کودنے والا ہے۔

مگر یہ جنگ کیسی ہے؟ کن قوتوں کے درمیان ہے۔ کیا یہ وہی جنگ تو نہیں جو ازل سے نیکی اور بدی کے درمیان ہوتی چلی آئی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر جنگ میں نیکی کا محاذ کون سا ہے؟ اور بدی کا کون سا۔ نیکی کے محاذ میں کون کون شامل ہیں۔ کیا وہی لوگ جو ہمیشہ کے لئے ایسی ہی سہانی اور حسین راتوں کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں جن کا ذوق نہاں آسودہ نہیں ہے جو زندگی میں اپنے ماحول سے نفرت کرتے ہیں جس میں شورش جذبات کی تسکین نہیں ہوتی۔ اور جو کیف کے جاوداں لمحات کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں ——— نظم کا آخری مصرعہ پھر پڑھیئے "آج کی رات جاوداں کر لیں" یہ آخری مصرعہ نیکی کی ان تمام طاقتوں کو یکدم ہمارے سامنے اُجاگر کر دیتا ہے جو ساری نظم کے مختلف ٹکڑوں میں ہمیں نیم تاریک سی، نیم روشن سی، بکھری بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ہر رات کو حسین اور سہانی بنانے کے آرزومند لوگ اور اس رات کو ایک جاوداں رات میں بدلنے کا عزم رکھنے والے لوگ ہی دراصل نیکی کی وہ قوتیں ہیں جو بدی کی طاقتوں سے برسرپیکار ہونے کے لئے کل صبح سفر پر جانے والی ہیں اور شاعر تو اُن

قوتوں کا ایک حصہ ہے، ایک نمائندہ ہے، ایک علامت ہے، ایک ذریعہ ہے جس کی امداد سے ہم نظم میں ان قوتوں کی تلاش کر لیتے ہیں۔

اور اب ہمارے لئے بدی کی طاقتوں کی تلاش بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ہمیں صاف نظر آجاتا ہے کہ بربریت کے جو کارواں زندگی کی حسین تمناؤں کو روندتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ جو زہریلی ہوا کی طرح چل رہے ہیں اور جن کی بربریت اور وحشت سے زندگی خاک و خون میں لتھڑی جا رہی ہے وہی بدی کی طاقتوں کی علامتیں ہیں۔

اور شاعر کو بدی کی طاقتوں کی ان شیطانی حرکات پر غصہ آرہا ہے۔ چونکہ وہ شاعر ہے، اُسے حُسن سے پیار ہے، اسے کیف اور نشاط سے محبت ہے، وہ زندگی کو سہانا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ بدی کی طاقتیں حُسن اور کیف اور سہانے چمن کو روندے چلی جا رہی ہیں تو اس کی کشتِ ہوش میں ایک اُبال سا آجاتا ہے اور وہ ایک مجاہدانہ عزم کے ساتھ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اُن شیطانی طاقتوں کو مقابلہ کا چیلنج دے گا۔ وہ اس آگ اور خون کے دریا میں کود پڑے گا اور حُسن اور سہانے چمن کے ان دشمنوں کو شکست دے کر دم لے گا۔

مگر یکدم جیسے شاعر کو خیال آتا ہے کہ وہ تو ایک شاعر ہے، صرف ایک شاعر، الفاظ کے حُسن کا خالق۔ آتش و آہن کی اس جنگ میں بھلا اس کے پاس کون سے ہتھیار رکھے ہیں !——؟؟ اس خیال کے آتے ہی اس کی شاعرانہ حِس اس کی امداد پر اُترتی ہے اور اس سے کہلواتی ہے کہ اگر اس کے پاس آہنی ہتھیار نہیں ہیں تو کیا ہوا؟! اس کے ہاتھ میں قلم تو ہے؟ چنانچہ وہ اپنے قلم کو سازِ زیست کا روپ دیتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے ؎

چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں کے لبِ گفتار

اب ہمارے سامنے نظم کے اہم مرکزی کردار یعنی نیکی کے نمائندے کے جذباتی نقوش کافی حد تک نکھر آئے ہیں۔ وہ حُسن کا پرستار ہے۔ کیف و مستی کا آرزومند ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا باطن بہت چوکنا بھی ہے۔ وہ ایسا حسن پرست نہیں ہے جو صرف خوابوں کی دنیا میں۔ تخیل کے ہیولوں کے ساتھ رقص کرتا رہتا ہے بلکہ وہ اپنے گرد و پیش کا بھی بھیدی ہے۔ وہ رقصِ بربریت کو اپنی حسین اور سہانی فضاؤں کا دشمن سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اس رقص کے تسلسل کو توڑنے کے لئے جد و جہد کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ جب تک وہ اپنے لبِ گفتار سے آگ نہیں برسائے گا اس وقت تک رقصِ بربریت جاری رہے گا۔ چنانچہ یہی رات اس کے جمود کا انجام اور جد و جہد کا آغاز بن جاتی ہے۔

اور یہاں ہماری وہ الجھن بھی صاف ہو جاتی ہے کہ آج کی رات اور کیوں باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کی رات سے پہلے کی تمام راتوں میں وہ ایک کشمکش کا شکار رہا ہے۔ یہ کشمکش اس کے رومانی تخیل اور ٹھوس عمل کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ اس سے پہلے وہ محبوبہ کی آغوش کی گرمی ہی کو آسودگیٔ ذوقِ نہاں کا منبع سمجھتا رہا ہے۔ نظم میں کئی مقامات پر آپ کو لفظ "نہاں" بار بار ملتا ہے جو اس کے باطنی آدرش کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی کھیتی میں کچھ تمنائیں بوئی ہوئی ہیں۔ مگر وہ تمنائیں صرف تخیل کی گہری زمین میں دفن ہیں۔ وہ کونپلوں کی طرح پھوٹتی نہیں ہیں۔ شاعر نہ جانے کتنی راتیں اُن کونپلوں کے پھوٹنے کے انتظار میں گذار چکا ہے۔ مگر ذوقِ نہاں کی یہ کونپلیں پھوٹتی ہی نہیں۔ چنانچہ وہ حیران ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کونپلیں کیوں نہیں پھوٹتیں، ذوقِ نہاں کی تسکین کیوں نہیں ہوتی؟ آدرش کی تکمیل کیوں نہیں ہوتی!

اور یہ کشمکش اس کی روح کو یخ بستہ کر دیتی ہے۔ مگر اچانک ایک رات کو اس کا سامنا خاک و خون میں لتھڑی ہوئی زندگی سے ہوتا ہے جو شاعر کی یخ بستہ روح کو اس کی کشمکش اور ابتلا کو جھٹکے دے دے کر بیدار کر دیتی ہے اور اسے بتاتی

مجاز نمبر

ہے کہ تمہارا ذوق بھی خاک و خون میں لتھڑا ہوا ہے اور میرا بھی۔ میں اور تم دونوں ایک ہی غم کے دو روپ ہیں۔ ہم اور تم دونوں ایک دوسرے کا ٹوٹے حصہ ہیں۔ اگر ہیں خون آلودہ رہوں گی تو تمہاری حسین تمنائیں بھی لہو میں لتھڑی رہیں گی۔ تمہارا ذوقِ نہاں در اصل میری ہی تمناؤں کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ آؤ ہم اور تم ایک دوسرے کے اضطراب کو پہچان لیں۔ انھیں یکجا کر دیں اور اس مشترکہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ اور ع

ذوقِ پنہاں کو کامراں کر لیں

اور ع

روح بخ بستہ ہے تپاں کر لیں

بس اس مرحلہ پر یکدم شاعر کی آج تک کی ساری کشمکش کو ایک صاف اور واضح راستہ مل جاتا ہے۔ آج تک کی وہ تمام راتیں جن میں وہ حسین خواب و خیال کے جال بنتا رہا ہے مگر اُن کی تعبیر سے محروم رہا ہے اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ وہ ماضی کی ان راتوں کی طرف مڑ کر صرف ایک بار دیکھتا ہے اور پھر جیسے فرطِ مسرت سے اچھل پڑتا ہے، جیسے ایک معصوم بچے کی طرح اپنی مطلوبہ چیز پا کر خوشی سے چیخ اٹھتا ہے اور فیصلہ کن لہجہ میں کہتا ہے ؎

آج کی رات اور باقی ہے

کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے

عمل اور جدوجہد کا یہ راستہ پا کر اس کی مسرت کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ تخیل کی کمیں گاہ سے نکل آتا ہے اور عمل کی رزمگاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ راستہ صاف ہے لڑائی لازمی ہے۔ کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی الجھن نہیں۔

اور مسرت کے احساس کا یہ نشہ اس کے اعصاب کو تند و تیز کر دیتا ہے۔ یہ ایک آخری رات ہے۔ کل وہ لبِ گفتار سے آگ برسائے گا۔ چنانچہ آنے والی کل کی آتش انگیز کیفیت کا تصور اس کے آج کے موڈ کو بھی آتش انگیز کر دیتا ہے۔ اسے محبوبہ کا بوسہ آتشیں محسوس ہوتا ہے۔ پیمانۂ مے اُبلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں پوری نظم میں شروع سے آخر تک ایک گرمی اور اُبال ہے۔ ایک تپتی اور جلتی ہوئی کیفیت ہے۔ کیونکہ کل سے شروع ہونے والی لڑائی بھی تو تپتی اور جلتی ہوئی لڑائی ہے۔ اور آج کی رات جو اُسے فراغت اور کیف کے یہ چند لمحات میسر آئے ہیں وہ انھیں بھی ایک جاوداں گرمی اور تپش عطا کر دینا چاہتا ہے۔ شاید آج تک کی تمام گذشتہ راتوں میں اسے سب سے پہلے یہی ایک رات ایسی میسر آئی ہے جبکہ وہ شورشِ جذبات کی تسکین کا حقیقی راز پا سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو بھی اپنے اس اُبلتے تپتے ہوئے راز میں شامل کر دینا چاہتا ہے۔ اُسے اُکساتا ہے۔ اسے بھڑکاتا ہے۔ یہ اُکساہٹ اور بھڑکاہٹ ہمیں نظم کے کئی مصرعوں میں بار بار سنائی دیتی ہے

ع ایک پیمانۂ مے سرجوش

ع لطفِ گفتار گرمیٔ آغوش

ع روحِ بخ بستہ ہے تپاں کر لیں

ع ایک دو اور ساغرِ سرشار

ع کچھ طبیعت تو ہم رواں کر لیں

ع کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں

ع کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات

اور پھر آنے والی جدوجہد کے بارے میں شاعر کا یہ واضح تصور کہ مقابلہ روحِ بربریت سے ہے، بدی کی طاقتوں سے ہے جو دوران جدوجہد میں ان دونوں کو وصال کے یہ پُرکیف لمحے نہیں دیں گی۔ اور ؎

پھر کہاں یہ حسین سہانی رات یہ فراغت یہ کیف کے لمحات

اس لئے کیوں نہ ہم اس لمحۂ غنیمت کو اتنا پُرجوش بنادیں، اتنا گرما دیں، اتنا تاباں کردیں کہ اس کی چھوٹ ہماری آنے والی جدوجہد پر بھی پڑ جائے۔ اور آج کی رات ایک ایسی جاوداں مسرت، جاوداں نشاط، جاوداں کیف اور جاوداں آسودگی کی علامت بن جائے۔ جب ان حسین اور سہانی راتوں کو بربریت کے کارواں خاک و خون میں نہیں لتھڑ دیں گے۔

اور یوں نظم کے عنوان "مہمان" کی گرہ بھی کھل جاتی ہے جو اب صرف ایک رات کے لئے محبوب کا مہمان ہے اور کل اُسے چلے جانا ہے، آج وہ بزم میں ہے، کل اسے رزم میں جانا ہے۔ لیکن کیا یہ ایسا مہمان نہیں ہے جو رزم سے لوٹ کر دوبارہ بزم میں لوٹ آنے کا آرزومند ہے؟ مگر نظم بھی اس سلسلہ میں کوئی اشارہ نہیں دیتی۔ کیونکہ وہ تو ہیں جدوجہد کے میدان میں چھوڑ کر ختم ہو جاتی ہے۔ شورش جذبات ہی اس نظم کا آغاز ہے اور شورش جذبات ہی انجام۔

فیض احمد فیض

اِنقلاب کا مطرب

[فیض کا یہ مطبوعہ مضمون اپنی گیرائی اور گہرائی کے باعث ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ اسے دوبارہ شائع کر کے مجاز کی شاعری کے مستند پہلو پیش کئے جائیں]

آہنگ کا پہلا اڈیشن اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز کی شاعری انہیں تینوں اجزا سے مرکب ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول بھی ہے۔ ہمارے بیشتر شعراء نے ان عناصر میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا دھنی لیکن کامیاب شعر کے لئے (آج کل کے زمانے میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ضروری ہیں۔ ؎

دلبری با قاہری جادو گری است

مجاز کے شعر میں یہ امتزاج موجود ہے ——— اس امتزاج میں ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لئے ایک خاص قسم کے دماغی زہد کی ضرورت ہے۔ لیکن مجاز کی طبیعت میں زہد کم ہے۔ لذتیت زیادہ۔ شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ دماغی زہد سے میری مراد ہے ایک مخصوص ایک انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں کُلی ذہنی اور جذباتی یکسوئی، تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز، یہ کٹھن اور محنت طلب عمل ہے۔ مجاز ہم سب کی طرح لاابالی اور سہل نگار انسان ہیں۔ چنانچہ جب بھی انہیں ذوقِ پنہاں، کو کامرانی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔

مجاز کے شعر کا ارتقاء بھی ہمارے بیشتر شعرائے مختلف ہے۔ عام طور سے ہمارے ہاں شعر یا شاعر کا ارتقائی عمل یہ صورت اختیار کرتا ہے۔ ساز و جام، ——— ساز و جام، شمشیر شمشیر، مجاز کے شعر میں اس عمل کی صورت یہ ہے۔ ساز و جام ——— شمشیر ——— ساز و جام، شمشیر، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رجعت نہیں ترقی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کے مضمون اور تجربہ میں مطابقت اور موانست زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر کی طبیعت خارجی اور انقلابی مضامین کے اینٹ پتھر کو تراشنے اور جوڑنے جانے میں زیادہ لذت محسوس کرنے لگی ہے۔

مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے، اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی گرج نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی، لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہ آیا، کبھی اس نے آغازِ بلوغت کی بھرپور بےفکرانہ خواب نما محبت کے گیت گائے ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حدِ نظر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
وہ تبسم ہی تبسم کا جمالِ پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہائے ؎

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

کبھی اس خالص تخریبی اور مجبور پیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ حال کے متعلق ہر نوجوان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردِ عمل ہوتا ہے ۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
اک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کا تجزیہ کیا۔ جس کے نقوش صرف غور و فکر کے بعد دکھائی دینے لگتے ہیں ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی!
رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک، ادھر دیکھا تو ہے

رنگا رنگی متنوع مرکب ہے۔ لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم بے آہنگ، اس کی دھن پھیکی، یا اس کے سُر بے سُرے نہیں ہوئے۔ مجاز کے کلام میں پُرانے شعرا کی سہولتِ اظہار ہے، لیکن ان کی جذباتی سطحیت اور محدود خیالی نہیں۔ نئے شعرا کی نزاکتِ احساس ہے، ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں۔ اس کے ترنم میں چاندنی کا سا نیا فسانۂ حُسن ہے۔ جس کے پرتو سے تاریک اور روشن چیزیں یکساں دل کش نظر آتی ہیں۔ غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے۔ جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجب پُراسرار، پُرمعنی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعینہٖ جیسے عنفوانِ شباب میں سادہ پانی نے رنگیں دکھائی دیتا ہے یا نئے رنگیں کے اثر سے بے رنگ چہرے عنابی ہو جاتے ہیں۔
مجاز کو اس کیمیائی عمل پر قدرت ہے ؎

ہمدم یہی ہے رہگزرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

ضو فگن ڈوئے حسیں پر شبِ مہتاب شباب
چشمِ مخمور نشاطِ شبِ مہتاب سے لئے
نشۂ نازِ جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب سے لئے

سکونِ دیر، تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی
یہ تربت ہے امیرِ کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہگزر بھی

یہی غنائیت مجاز کو اپنے دَور کے دوسرے انقلابی اور غنائی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔
مجاز کی غنائیت عام غنائی شعرا سے مختلف ہے۔ عام غنائی شعرا محض عنفوانِ شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک اِن کی شدت اور قوت نمو ختم ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ عام غنائی شعراء کی شاعرانہ عمر بہت کم ہے۔ ان کا اوسط سرمایہ پانچ دس کامیاب عشقیہ نظمیں ہیں۔ بعد میں وہ عمر بھر انہیں پانچ دس نظموں کو دہراتے رہتے ہیں۔ یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقا کی گنجائش اور پنپنے کا امکان ہے، اس کے شباب میں بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ عام نوجوان شعرا کی غنائیت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں۔ موت کے سکون کی ہوس ہے۔ مجاز گرم زندگی کے نشے سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے ؎

مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے، اداسی نہیں سرخوشی ہے، مجاز کی انقلابیت، عام انقلابی
(باقی صفحہ ۶۱ پر دیکھیے)

فیض الرحمٰن اعظمی

مجاز کی شاعری

جس زمانے میں مجاز نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا وہ ہر لحاظ سے ادبی، سیاسی اور سماجی بہت پُرآشوب زمانہ تھا اور پھر مجاز نے تعلیم بھی ایسی جگہ پائی تھی جہاں سیاست اکثر تعلیم سے پیش پیش رہی ہے۔ ایک طرف بڑھتی ہوئی عوامی تحریکیں اور دوسری جانب صدہا سال کی فرسودہ اردو شاعری خاص طور پر غزل گوئی مجاز کی شخصیت اور شاعری کی بناوٹ میں یہ تمام مختلف دھارے آکر مل گئے ہیں۔ اس کی شاعری کا خمیر تغزل سے اٹھا ہے اور شروع میں تو اس کے اندر بہت کچھ رومانی داخلیت اور انفرادیت تھی اور سماجی شعور کی کمی۔ لیکن بعد میں اس کا نقطۂ نظر بہت کچھ بدل گیا۔ اور اس نے اپنی بڑھتی ہوئی رومانیت اور انفرادیت کو ایک نئے بڑھتے ہوئے اجتماعی شعور سے ہمکنار کر دیا گو صدیوں کی پرانی روایات اس سے لپٹی رہیں۔ دیکھئے اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

عشق ہے عشق ہے دنیا مری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
رشکِ صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں

لیکن ترقی پسندی کی تحریک سے وابستگی نے اس کی فطری لاابالی پن کو صحیح راستہ اور نفسِ مضمون دیا اور وہ پہلی سی داخلیت اور انفرادیت بہت کچھ کم اور ختم ہو گئی لیکن اس کے لئے کیا کیجئے گا کہ مجاز ہمیشہ گاتا رہے گا۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری کے اندر غنائیت اور موسیقیت بہت ہے۔ فیض کے بقول اس کے شعر کی ترتیب عموماً یہ ہوتی ہے۔ ساغر و جام شمشیر۔ ساغر و جام شمشیر۔ گو شمشیر کی تیزی اور کڑک اس کے اندر ساغر و جام کی کیف و مستی کے مقابلے میں کم ہے یہ قصور مجاز کا نہیں بلکہ اس کی فطرت کا ہے۔ جو حقیقتاً غزل کے اجزائے ترکیبی سے اٹھی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجاز نے خالص انقلابی موضوعوں پر قلم ہی نہیں اٹھایا۔ یوں تو خیر ترقی پسند شاعروں میں سے ایسے بہت سے مل جائیں گے۔ جو خالص انقلابی موضوعات پر کچھ بھی نہیں لکھ سکے۔ خود فیض کی شاعری جس نے پوری ایک پود کی پرورش کی ہے۔ عشق اور انقلاب میں کسی ایک کے ساتھ اپنا معاملہ طے ہی نہیں کر سکتی۔ وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر، ہر جگہ جھلکتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی ترقی پسندی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ترقی پسندی اور اشتراکی حقیقت نگاری ادب کی جمالی تاثیر اور استعارے اور تخلیقی تخیل کو رد نہیں کرتی۔ گورکی کے مطابق اشتراکی حقیقت نگاری میں انقلابی رومانیت بھی شامل ہے جو اپنی افادیت، اپنی حرکت، اپنی قوتِ ارادی کی وجہ سے بورژوا تصوریت سے مختلف ہے۔ نیز یہ خیال کہ حقیقت کے کسی خطہ کے تمام پہلوؤں کی کلیت سے ترتیب پاتا ہے۔ ہماری شاعری میں صحت مند رومانیت کی بہت گنجائش رکھتا ہے۔

مجاز کی رومانیت ـــ

مجاز کی رومانیت مریضانہ اور غیر صحت مند نہیں وہ اسے انقلابی موضوعوں پر قلم اٹھانے سے روکتی نہیں۔ گو یہ احساس اس سے دور نہیں ہوتا ـــ ؟

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

یہ اس لئے کہ شاعر اپنے خارجی ماحول، اپنے زمانہ کی ابھرتی ہوئی عوامی قوتوں اور تحریکوں سے انکار اور گریز بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس [illegible] کے عالم میں اس کے حسین خواب پورے بھی نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے غالباً وہ اس کی شکست پر آنسو بہاتا ہے۔

؎ اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجیے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

میتھو آرنلڈ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ہم دو دنیاؤں کے درمیان رہ رہے ہیں، ایک دنیا مر رہی ہے اور دوسری دنیا ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ لیکن آج وہ دوسری دنیا پیدا ہو چکی ہے۔ آج جبکہ دنیا دو مخالف کیمپوں میں بٹ گئی ہے شاعر اور ادیب غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ سچا ہو تو امن اور انسانیت کا علمبردار ہے، وہ ایسی قوت کے ساتھ ہے جو ترقی اور انقلابی ہے۔ اور جس کے ساتھ رہ کر وہ سماج کی تعمیر اور تشکیل میں حصہ لے سکتا ہے۔

انقلابی نظمیں

؎ بھڑکتی جا رہی ہے دم بدم اک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی یہ کیا دور ہے ساقی

مجاز کی کامیاب انقلابی نظموں میں گو تعمیری لحاظ سے نہ سہی، اسکی نظم آوارہ کو ایک خاص وقعت حاصل رہی ہے۔ یہ رومانی انقلابیت کی آئینہ دار ہے۔ اس قسم کی نظمیں ہر ملک کے رومانی عہد میں خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہیں۔ یہی آوارہ جو سڑکوں پر ناشاد و ناکارہ پھر رہا ہے، ہمارے تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ایک طرف بے کاری اور ادبار تلے دبا ہوا انسان اور دوسری طرف سرمایہ داروں کی تعیش پرستی اور لوٹ کھسوٹ، ان کا ظلم اور انسانیت ناشناسی آوارہ کو ایک خاص انسانی نقطۂ نگاہ بخشتا ہے۔ جو بدی کو مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن اس میں مقصد کا فقدان ہے، یہاں شاعر کے داخلی احساس سے نظم کا خارجی ماحول بھی داخلی بن جاتا ہے۔ ؎

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی!
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے کہ یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لیکن یہ احساس تخریبی ہے، ابھی توڑ پھوڑ اور تخریب کے بعد تعمیر شروع ہو گی۔ یہ نظم بہت کچھ جذباتی اور ہیجانی کیفیات کی آئینہ دار ہے۔ شاعر کا تصورِ مستقبل ذرا ابھی خام ہے لیکن اس تعمیری نقطۂ نگاہ کے فقدان کے باوجود بہ حیثیت مجموعی آوارہ دولت کی غلط تقسیم سے پیدا شدہ بے کاری اور اس کے شکار بے کار نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی دماغی اور نفسیاتی الجھنوں اور پریشانیوں کا نچوڑ ہے۔ لیکن اس کے بعد مجاز کا نقطۂ نظر زیادہ واضح اور صاف ہو جاتا ہے اور آوارہ کی اندرونی خلش اور الجھن، یقین اور مستقبل کے ایک واضح تصور میں تبدیل ہو جاتی ہے "دیکھے خواب سحر" میں وہ کس پندار کے ساتھ کہتا ہے ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی
رہبری جاری رہی، پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زرگری جاری رہی
یہ مسلسل آفتیں یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام
ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں!
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ یقین "اندھیری رات کا مسافر" میں اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ مسافر یعنی نیا انسان، ظلم بربریت اور انسانیت ناشناسی کے باوجود ذہنِ انسانی پر مہیب تاریکی بن کر چھا گئی ہے، اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کوئی طاقت اسے سفر سے باز نہیں رکھ سکتی۔ کوئی صعوبت راہ اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ ملاحظہ ہو۔

چراغِ دیر، فانوسِ حرم، قندیلِ رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیازِ نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے نہ آہنگِ حدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

مجاز کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ خواہ کتنا ہی انقلابی موضوع ہو اور کتنا ہی ترقی پسند خیال، وہ جمالی تشبیہ اور استعارے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اس کی بعض نظمیں ندرت بیان، جدت طرازی، جدت استعارات اور تشبیہات کی وجہ سے بڑی پیاری ہیں۔ "بتانِ حرم" کا یہ شعر

آہ وہ دوشیزہ لب، گل زیر لب گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

یا پھر خالص عشقیہ نظموں کے یہ اشعار

نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حد نظر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال!
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

وہ میرے آسماں پہ اختر صبح قیامت ہے
ثریا بخت ہے زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے، میری زندگی ہے میری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

لیکن اس کی نظم "رات اور ریل" جدید تشبیہات اور استعارات اور پھر اپنی انقلابی رومانی۔ رمزیت کی وجہ سے بہت پیاری اور دل کش ہے۔ یہ نظم شاعر کو ایک نیا پیغام دیتی ہے۔ نظم کا مرکزی تصور بالکل ترقی پسند ہے۔ لیکن یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے جمالیاتی حس کو کہیں بھی ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔

نغمگی

مجاز کی شاعری میں ایک بڑی خصوصیت جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا، اس کی نغمگی اور غنائیت بھی ہے ـــ وہ انقلاب کے متعلق گرجتا نہیں گاتا ہے۔ لیکن اس سے اس کے یقین اور مستقبل کے بارے میں اس کے واثق یقین میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ غنائیت غیر صحت مند اور مریضانہ نہیں بلکہ مستقل مسائل سے وابستہ ہے۔ کیسا ہی ٹھوس انقلابی موضوع ہو اور کتنا ہی سنجیدہ خیال لیکن یہ نغمگی یہ موسیقیت اس سے دور نہیں ہو سکتی۔

مرتب اک نیا دستور ہوگا
بنا اک دور نو کی پڑ رہی ہے
سکون دیر، تقدس کلیسا
گمان امت خیرالبشر بھی
یہ تربت ہے امیر کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمع رہ گزر کی

مجاز کی ایک دوسری خصوصیت جو اسے دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے، اس کے نفسیاتی تجزیے ہیں۔ انقلابی قدروں میں سے اس نے آزادیِ نسواں پر بہت زور دیا ہے۔ "مجبوریاں" "شوق گریزاں" "نوجوان خاتون" "اور پردہ اور عصمت" اس کی بڑی اچھی مثالیں ہیں "نوجوان خاتون" اپنی شوخی اور استدلال اور نفسیاتی رنگ اور بصیرت کی وجہ سے بہت دلکش اور ممتاز ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر جھکایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور کبھی وہ سہمی ہوئی عصمت کا تجزیہ یوں کرتا ہے ـــ

جو ظاہر نہ ہو وہ لطافت نہیں ہے
جو پنہاں رہے وہ صداقت نہیں ہے
یہ فطرت نہیں ہے مشیت نہیں ہے
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

قسم شوخیِ عشق بے خود نما کی — قسم حسن کے عزم صبر آزما کی
قسم طاہرہ کی قسم خالدہ کی — کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

ظ۔ انصاری

اونچی آواز کی سوچ بچار

۶ دسمبر کی صبح کو نرم بستر میں لیٹے ہوئے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر جو میں نے اخبار خریدا، اسی میں ایک طرف کو مجاز کی موت کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ میں نے سنبھل کر پوری خبر پڑھی۔ نہ دل دھڑکا نہ کوئی حیرانی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے معمول کے مطابق ہی کوئی بات ہوئی ہے۔ بلکہ اگر اخبار میں کہیں یہ اطلاع موجود ہوتی کہ مجاز نے "ساغر ہے یہ، جام ہے یہ" کہہ کر بوتل دیوار سے دے ماری اور خود شمشیر اٹھا کر حضرت گنج لکھنؤ میں کسی کے پیچھے دوڑ پڑے تو واقعی حیرت کے مارے سکتہ ہو جاتا۔

مجاز نے ادھر ۱۰ برس سے دھیرے دھیرے مرنے کی رفتار تیز کر دی تھی۔ رانچی کے دماغی شفاخانے میں دو بار ان کا رہنا، دلی میں ... گردی کرنا، دن بھر لب بند کئے گھومنا، سب اسی اعلان مرگ کی تمہید تھی۔ اور یقین کرنا چاہیے کہ مجاز اپنی زندگی میں اس دن باخبر ہو گئے تھے جو موت کے لئے متعین ہے۔ اس کی گنہ خود ان کی شاعری سے آخری زمانے میں اور ان کے اطوار سے ملتی ہے۔

میں کہ خود اپنے مذاق طرب آگیں کا شکار
وہ گداز دل مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

وہ زندگی میں اس وضع کے آدمی تھے جس نے ادب اور فن کی محفل سے کئی جواں مرگوں کی بھاری لاشیں اٹھائی ہیں۔ وہ رویہ ان کی پوری شاعری کی رگ رگ میں پیوست ہے۔ کہ

یا خلد و ساقی لے جذب مستی		یا ٹکڑے ٹکڑے دامان ہستی

زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں نعمتوں اور راحتوں کا آب رواں ہر ایک کھیت سے گزرتا ہے کہیں گہرا ہو کر، کہیں اتھلا ہو کر۔ کچھ لوگ جو بالکل ہی بے نیاز نہیں رہتے اپنے کھیت سینچ لینے پر قناعت کرتے ہیں۔ کچھ عاقبت اندیش ایسے ہوتے ہیں کہ کنوؤں اور نالیوں میں اپنے حصے کا پانی گھیر کر رکھ لیتے ہیں اور ایک زمانے تک فیض اٹھاتے رہتے ہیں اور کچھ لوگوں کی طبیعتیں بڑی طوفانی ہوتی ہیں۔ وہ اسے چٹانوں پر کا بشار بنا کر گراتے ہیں، دھواں دھار روانی سے لطف اٹھاتے ہیں اور اس سے بجلیوں کی شدت و حرارت اخذ کرتے ہوئے خود کو دے پڑتے ہیں۔ "ادب ... بے معنی غرق ساغر ناب ابدی" کا اعلان در اصل زندگی اور فن میں اسی رویے کا اعلان ہے۔

میں تو نہیں سمجھتا کہ مجاز نے یہ شعر محض خوش بیانی کے بل پر کہہ لیا ہوگا۔

اس محفل کیف و مستی میں، اس انجمن عرفانی میں		سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

ان کی ساری زندگی اسی سے عبارت ہے اور تمام تر شاعری ان کی زندگی ہے۔ یہی ان کی بے پناہ مقبولیت کا سبب تھا اور یہی ان کی موت کا باعث۔ میں اگر خدا اور بزرگ و برتر ہوتا تو "محفل کیف و مستی" اور "انجمن عرفانی" کے ان صدر نشینوں کو ... بھیجتا کہ دیکھو تمہیں جذب و مستی اور عرفان کی یہ خاص تجلی صرف اس شرط پر بخشی گئی ہے کہ اسے سینے سے لگائے ہر پاس ادب بیٹھے رہو۔ اور دوسروں کے ...

گئے دیو۔ اگر اپنے حصے کی پینے اور چھلکانے میں عجلت کرو گے تو یاد رکھو کہ کڑی سزا پاؤ گے۔ سامنے کا دروازہ بند ہے۔ تمہیں باہر جانا نہیں ملیگا۔ تمہیں خضر کی عمر عطا کی جاتی ہے جس میں زندگی بھر دوسروں کو پیتے دیکھو گے مگر خود نہ پی سکو گے۔

یہ کڑی سزا مجاز کو ۴۴ برس بھگتنی پڑی۔ منٹو کو سال بھر، اختر شیرانی کو ۴۵ سال، میرا جی کو ۳۸ برس۔ اس طرح سب اپنی اپنی بلا کا بھر کر چل دیئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کاندھے سے اپنی لاش اتاری۔ دوسروں کے کاندھے پر ڈالی اور خود غائب ہو گئے۔ یہ شریف بیچاری ان جانے والوں کی نہیں۔ ہماری ہے۔ ہماری کہ ہمیں ان کا دفن کرنا مقدر ہوا۔

منٹو جس روز مرے ہیں۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو کرشن چندر اچانک شاہراہ کے دفتر میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ان کے قدم رکھتے ہی میں نے منٹو کی موت کا ذکر کیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر سناٹے میں آ گئے۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ ان میں آنسو پینے کا یارا نہیں رہا تو عرض کیا کہ ابھی تھم جایئے۔ اور کچھ دن ضبط کیجئے۔ منٹو اور مجاز کو ایک ساتھ ہی رو لیجئے گا۔

وہ اس پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ صرف منٹو کو نہیں روئے۔ ان سب کا ماتم کیا جن کے گلے میں باہیں ڈال کے وہ پہروں قہقہے لگا چکے تھے۔ جن کے جام سے جام ٹکرا چکے تھے۔ جن سے لڑ چکے تھے لڑا چکے تھے۔ پیار کر چکے تھے۔ وہ سب جنہوں نے لذت پسندوں کو پیچھے چھوڑا لذت کوشی اور لذت پرست صفوں کو توڑ کر بڑھے، بڑھ کر ڈبکی لگائی۔ موت کی خریداری کی۔ اور اپنی متاع بے بہا، جو ہم سب کی خاطر ان کے پاس امانت تھی۔ لٹا آئے۔

کچھ دوست منٹو اور مجاز کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے اونچی اڑان دکھائیں گے اور کہیں گے کہ یہ سب سماج کا قصور ہے۔ سماج ایسا ٹیڑھا میڑھا بنا ہوا ہے کہ اس میں شاعر کیف جیسی کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ طائر خوش نوا تھکن کے مارے نڈھال ہو کر گر پڑتے ہیں۔ مسلسل ناکامیوں سے مستقل اداسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے ہاتھوں کسی بہانے اپنا کام تمام کر لیتے ہیں۔ شراب نوشی کی کثرت ان بہانوں میں سے ایک بہانہ ہے۔

یہ کیسی نامعقول بات ہے۔ جبر پرست نکمیتیوں کی سی بات۔ مستقل شکوہ گزار، ناکاروں کا سا لہجہ۔ مجھے گھن آتی ہے ایسی جبریت کی شکوہ سامانیوں سے۔ زندگی اور سماج تو صاحب سب کے لئے ایک سے ہیں جیسے بھی ہیں۔ ہمیں تیشہ زنی کے لئے للکارتے ہیں۔ جن میں احساس کی دھار تیز تر ہے انہیں زیادہ للکارتے ہیں۔ قدرت نے جن لوگوں کو فکری اور ذہنی حرارت زیادہ بخشی اور میدان حیات میں بھیجا ان کو عام آدمیوں کے مقابلہ میں زیادہ مسلح کیا گیا ہے کہ جاؤ اور جا کر بھڑ جاؤ۔ ہٹ کے مت بھاگنا۔ اور یہی نہ کرنا کہ اس دھار کو، اس شدت حرارت کو اپنی ہی صفوں میں دکھاتے رہ جاؤ۔ جو ایسا کرے گا وہ کام سے جائے گا۔

اب اگر اس عمر کے میں ہمارے بہترین جواہر پارے "اپنے ہی مذاق طرب آگیں کا شکار" ہونے لگے ہیں تو آپ بین کرتے کرتے سماج کو کیوں کوستے ہیں۔ اگر پورا سماجی ڈھانچہ بر نمونہ جنت کے نمونے پر ڈھال کر آپ کے حوالے کر دیا جاتا کہ جو چاہو جہاں چاہو چر لو۔ جب چاہو چر لو۔ تو آپ سمجھتے ہیں کیا تیر مارتے؟ ایسی جنت کے لئے تو ملا کافی تھے۔

بعض لوگ اپنے جی کی بھڑاس نکالیں گے یہ کہہ کر کہ اب میں جب تک کھلی فضا تھی مجاز نے خوب پرواز کی۔ جدید شاعری کی کئی بہترین غنائی نظمیں ان کی دین ہیں۔ لیکن جب تسر نماہب پر گرفت بندی اور لب بندی وہ پسندی مسلط ہوئی تو ان کا دم گھٹنے لگا۔ ان کی شاعری [illegible] گئی۔ انہیں تو دم سادھ کے رہ گئے۔

مگر یہ بھلے مجاز کی "آوارہ سرگشتہ" کس دن ان خانوں میں بند ہوئی تھی۔ انھوں نے تو سیاسی اور فکری رنگ کی شاعری میں بھی اپنی "نوائے شوق" کے لئے ایک دھیمی دھیمی مترنم تان پیدا کر لی تھی۔ "نوجوان خاتون سے" "آوارہ" "ایک جلا وطن کی واپسی" "مزار رہنما" "فکر" "خواب سحر" اور "عشرت تنہائی" جیسی نظمیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔

رہا ایسی شاعری کا معاملہ جس کا نمونہ "مزدوروں کا گیت" "انقلاب" "ہمارا جھنڈا" یا "آہنگ نو" ہیں تو ان نظموں کی بدولت

مجاز تر بات اور ان سے کم کر دینے سے مجاز کی نمائندہ شاعری کا کوئی جزو کم ہوتا ہے۔ ان کے لہجہ میں تاثر کی کیفیت بیان میں غنائی سرشاری اور وفور میں حسن و جس کا جادو ہی بنیادیں تھیں گہری تاثر کی جو مجاز کے لئے شاعر معصوموں کو حاصل نہیں ہوئی اور شاعری میں جاندار کرنے سے کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ جانثار اختر، اور فیض و جنگ کی شاعری کا اپنا ایک طریق ہے جس کی اہمیت بھی ہے۔ اور جس میں تاثیر بھی بڑی بھرپور ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند حلقوں میں بعض لوگوں کے ہاں کم و بیش موجود ہے۔ مجاز کو کسی حلقے یا کسی خاص فکری دائرے نے گھیر نہیں۔ وہ ان دانشور لوگوں میں تھے جنہیں صرف اپنایا جا سکتا ہے، باندھا نہیں جا سکتا۔ ان کا یہ کردار شروع سے آخر تک قائم رہا کہ سر عقیدت سے سو بار جھکے، مجبوری سے ایک بار بھی جھکنے نہ پائے۔ بلکہ وہ ان کی روز کی زندگی میں کھلا ہوا تھا۔ اور اس پر انھیں اپنانے والوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا تو پھر اس طرح کا الزام بھی لگایا جا سکتا تھا۔

مجھے پہلے جشن آزادی کی ایک صبح یاد آگئی۔ جب مجاز بمبئی میں تھے۔ لیکن مناسب ہو کہ میں اس سے سال بھر پہلے ہندو مسلم فساد کے دنوں کا قصہ بیان کروں کہ اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہی شہر بمبئی کا ذکر ہے۔ ہم بہت سے احباب اور ساتھی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ہیڈ کوارٹر میں شہر کی فرقہ وارانہ کشیدگی پر باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے آکر خبر دی کہ صاحب عجیب بہار ہے چلئے۔ گول پیٹھا بازار کے اس طرف دیکھئے جس علاقے میں ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا لوگوں نے ہار پھول اور ترنگے جھنڈوں سے ایک صف کھینچ دی ہے۔ اور سامنے مقابلے پر مسلم لیگ والوں نے کالی جھنڈیاں لگائی ہیں اور کانگریس لیڈروں کی تصویروں کے گلے میں جوتوں کے ہار ڈال رکھے ہیں۔ نشر اٹھوں نے مسلم لیگ کو ہٹا کر مرکزی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں کیوں لی؟ مجاز، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، حمید اختر، یہ لوگ تماشا دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی مشکل سے وہاں پہنچے ہوں گے کہ جو ہوا، اور وہ پھوڑا جو کئی دن سے پک رہا تھا پھوٹ بہا۔

جنگل میں آگ دیر سے پھیلتی ہے۔ لیکن بے ٹھکانے آدمیوں کے اس جنگل میں جس کا نام بمبئی ہے فتنہ جلدی پھیلتا ہے۔ یہ سب شعرائے کرام لپکتے جھپکتے آئے اور ہیڈ کوارٹر میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اب یہ عالم کہ بازار بند، ٹریفک بند، علاقہ چاروں طرف سے گنڈوں میں گھرا ہوا۔ ہر وقت آگ لگنے، گولی چلنے، اور قتل و غارت گری ہونے کے خطرے۔ مجروح تو اپنی شیروانی سمیت جیسے تیسے نکل گئے۔ باقی سب پھنسے رہ گئے۔ مجاز اوپر کے اسی کمرے میں رہے جس میں ہم لوگوں کی احباب کا کام کرتا تھا۔ وہ بار بار سہم کر کھڑکی کی لگا لیتے تھے اور جب سڑک پر کسی آدمی کو گھیر کر قتل کیا جاتا تھا تو لرزتے ہوئے اور "مار دیتے تھے" "ارے۔ رے رے۔ مار ڈالا، مار ڈالا" وہ تین بار پیرے سے تھکے ہوئے اعصاب کو ان کی آواز کے جھٹکے سہنے پڑے۔ میں بھی کھڑکی سے جھانکا۔ اور ایک بار یہ منظر بھی دیکھنا پڑا کہ یہی سیدھی سادی عورتیں جس پر سال بھر پہلے انگریزی فوج اور پولیس کا سامنا کرتے ہوئے شہریوں کی مدد کرنے کے لئے گھریلو گجراتی عورتیں اوپر کے مکانوں سے ریت اور پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر نیچے انڈیلتی تھیں، اسی سڑک پر پیارے اور انقلابی نعرے بلند کرنے والی وہی عورتیں اب کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی بالٹیاں زخمیوں اور لاشوں پر انڈیل رہی تھیں۔ اور فٹ پاتھ پر بے قصور شہریوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ مجاز تڑپ کر گرے، اور اٹھانے گئے تو انھوں نے پھر کھڑکی کھولی۔ پھر دیر تک اسی حالت کو دیکھتے رہے۔ پھر ہائے ہائے کرتے نڈھال ہو گئے۔ میری افتاد طبع ایسی ہے کہ ایسے ہی وقت مجھے چھیڑ خانی کی سوجھتی ہے۔ جب انھوں نے پھر خود کو دکھ دینے کے لئے سڑک کی طرف کھڑکی کھولی تو میں نے کہا۔ "کیا آپ اپنے اس خواب کی تعبیر دیکھنے چلے ہیں۔"

جھونپڑوں میں خون، محل میں خون، شبستانوں میں خون، انقلاب! دشت میں خون، وادیوں میں خون، بپا باغوں میں خون

مجاز بالکل چپ ہو گئے۔ پھر انھوں نے کسی کو آواز نہیں دی۔ لیکن رات بھر اس مرد بیمار پر بہت بھاری گزری۔ آنکھ لگتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے۔ اور یہ دیکھ کر کہ کچھ لوگ سو رہے ہیں، کچھ میرا اپنا کام کر رہے ہیں، آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے۔ اور دوسرے دن وہ شہر سے باہر جا کر رکھے گئے۔

یہ سب تو ہوا۔ ان پر فساد کے یہ دن بھاری ہی گزرے۔ وہ اس طوفان کے دوران بھی رہے اس کے اثرات سے دور بھی۔ ان کے کئی دوستوں نے اسی ماحول میں انھی دنوں نظمیں کہیں، غزل کہنا ان دنوں ذرا کٹھن تھا، مضامین لکھے، کہانیوں کی بھرمار کی۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے مجاز نے ایک مصرعہ اس طوفانی اور تباہ کار کیفیت پر نہیں کہا۔ جو آشکارا بھی تھی اور گہری بھی۔ اور نہ کسی نے ان سے اس کی فرمائش کی۔

سال گزر گیا۔ مجاز کچھ دن لکھنؤ رہ کر پھر بمبئی واپس آ گئے۔ اب جا۔ اگست ۴۷ء کی صبح نمودار ہوئی۔ یہ ہی بھی جوشی کا دور تھا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ہی جان دار پروٹسٹ اور سٹیٹمنٹ اپنے ماحول کے ذرے ذرے میں سمو دیتے ہیں۔ چنانچہ بمبئی کا درش میں جشن آزادی منانے کی تیاریاں کئی دن سے کی جا رہی تھیں ابھی پارٹی کے جسم پر کانگریس سرکار کی کے ظلم و تشدد کے زخم ہرے تھے کہ ایک دم ہمیں کانگریس کے ترنگے جھنڈوں سے اپنی ذاتی انقلابی سجانی پڑی۔ علاوہ نیلی جھنڈے لیکر سڑک پر جلوس کی شکل میں نکلنا پڑا۔ جلسوں کا انتظام کیا گیا۔ اور اس کے لئے مقرر اپنی تقریریں، شاعر اپنی نظمیں اور اہل قلم اپنے مضامین تیار کرنے لگے۔ سب لوگ کام میں جٹے ہوئے تھے۔ مجاز با ہمہ اور بے ہمہ گھوم رہے تھے۔ "ہم سمجھے نظم تیار کر رہے ہوں گے"۔ "مجاز! کچھ کیا؟" ہم نے جوش ملیح آبادی نے پوچھا۔ "جی نہیں"۔ "ارادہ بھی نہیں کیا"۔

صبح کو "جشن آزادی زندہ باد" کا جلوس نکلا۔ مجاز لاپتہ تھے۔ شام کو جلسہ ہوا مجاز نہیں تھے۔ رات کو شہر کی ساری آبادی سڑکوں پر نکل آئی گلی گلی ٹولیاں گھوم رہی تھیں۔ نعرے لگاتی ہوئی۔ شور مچاتی ہوئی۔ دیکھا تو ایسی ہی ایک ٹولی میں مجاز بھی رقص فرما تھے۔ سرشار اور از خود رفتہ سڑک پر ننگے پاؤں، ننگے سر کود رہے ہیں۔ اور پوری ٹولی اُن کے گیت پر تالیاں بجا رہی ہے۔ نعرے لگا رہی ہے۔

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

بول کہ تیری خدمت کی ہے	بول کہ تیرا کام کیا ہے
بول کہ تیرے پھل کھائے ہیں	بول کہ تیرا دودھ پیا ہے
بول کہ ہم نے حشر اٹھایا	بول کہ ہم سے حشر اٹھا ہے

بول کہ ہم سے جاگی دنیا
بول اری او دھرتی بول

ہم سب ساتھی بھی اسی ٹولی میں ڈوب گئے۔ ڈیڑھ پسلی کا آدمی مجاز صبح چار بجے تک اسی طرح تمام رات کھلی سڑکوں پر دھوم مچاتا گھوما کیا اس مرحلے پر مجاز کے تمام اعصاب کی گرہیں کھل گئی تھیں کیوں کہ غنائی شاعر کو غنائی ماحول اور خوابوں کے باشندے کو خوابوں کا پرندہ، حلقہ فکر تک خود بخود مل گیا تھا۔ مہینوں بعد انہوں نے وہ نظم کہی: "پہلا جشن آزادی"، جس میں طبع رواں کو کسی طرح کی مجبوری نظر نہیں آتی جیسی "مزدوروں کا گیت"، کے بعض بندوں میں نظر آتی ہے۔ یا "بول اری او دھرتی"، کے اس بند میں ہے!

نامی اور مشہور نہیں ہم	لیکن کیا مزدور نہیں ہم

کہنے کا منشا یہ ہے کہ وہ اس کینڈے کے آدمی نہیں تھے اور نہ بننا چاہتے تھے اس لئے کسی حلقہ فکر کے سر اُن کی خاموشی اور اداسی کا الزام دھرنا بد دیانتی ہے۔

نواب جعفر علی خاں اثر نے دور تک دیکھا تھا جب اُنھوں نے مجاز کو جواں مرگ کیٹس (Keats) سے تشبیہ دی لیکن بغیر پروں پر اُٹھائے جانے کا الزام دیکر اُنھوں نے صرف اپنے "بعض معاصرین" کو تسکین پہنچائی ہوگی۔

ماحول کے بے تکے پن اور حلقہ فکر سے ہم آہنگی کی بے بسی کا رونا روتے وقت لوگ اسی قبیل کے ایک شاعر کو کیسے بھول جاتے ہیں۔ عرفی کو دیکھئے کہ اکبر کا دبدبہ، اور جہانگیر کی محبت، ملا عبد القادر بدایونی کا احتساب اور حکیم ابوالفتح کی ہم نشینی۔ یہ ماحول اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا مگر وہ کج کلاہ اس درباری اور لشکری ماحول میں بھی بے باکانہ گزر دا۔ آخری سانس تک اس کے لئے شراب و ساقی بھی ارزاں تھے۔ اور بڑے قدردان بھی جھیل تھے۔ اور نیچا دکھانے کی تاک میں رہنے والے بھی ہم مجاز کے دور میں تو عرفی کے ارد گرد کی قدردانی، نااتفاقی اور سخت گیریوں کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن عرفی نے عشرت کدوں میں پناہ ڈھونڈی۔ نہ مے خانوں میں اپنی اداسی کا حل تلاش کیا۔ اور نہ اپنے

ہے کہ جب دنیا میں اور اپنے وطن کی سرمستی و چھلکا ہی میں ذرہ برابر بھی کمی کی۔ دوسرا جام شراب ہی سے۔ لیکن جام میں شراب نہیں مضمون کا گھلا ہوا زہر تھا۔ اور اس کی لاش سے گرد سے نہیں اٹھائی گئی۔ کیونکہ اس نے اپنی سرمستی اور احساس کی شدت و حدت کو "دماغی زہر" کی اس آنچ میں تپا لیا تھا جو آج تیز دھار پر شعور اشیاء میں پر بنے ہوئے ہاتھوں الکوحل کی اسٹیشنوں سے حاصل ہوتی ہے۔ جس سے آبِ رواں وحشت بنتا ہے اور جا رہتا ہے۔ اس "دماغی زہر" کی ترکیب لفظی میں ہمارے دوستوں کی علمی اور ذہنی تربیت کے لئے بڑا ایک درس پوشیدہ ہے۔ فیض نے مجاز کی کتاب پر دیباچہ لکھتے ہوئے اس کا مفہوم بیان کیا ہے: "دماغی زہر سے میری مراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں بھی طبعیت کی ذہنی اور جذباتی یکسوئی۔ تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ یہ کٹھن اور محنت طلب عمل ہے۔ مجاز ہم سب کی طرح لاابالی اور سہل انگار انسان ہیں۔ چنانچہ جب بھی ان کے ذوق پنہاں کو کارائی کا موقع ملے، باز نہیں رہ سکتے۔"

"باز نہ رہ سکتے" کی سزا مجاز کو کم ملی۔ ہمیں زیادہ۔ ہم جو انھیں چاہتے تھے۔ ان کے مداح تھے۔ دوست تھے۔ ان کے کلام کو سینوں سے لگاتے تھے اور ان کی شاعری کو، جو انتخاب کے مرحلے سے گذرے بغیر بھی سوائے چند اشعار کے سراسر انتخاب ہی انتخاب ہے اپنے بہترین ذخیرے میں شمار کرتے تھے۔ بھلا ہمارے فیض اور جذبی کے علاوہ کسی کے ہاں اس نغماتی آہنگ کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جس کی کائنات پر مجاز طاری ہے؟ اگر مجاز اور جیتے رہتے اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بے جا قدردانی اور بے جہد شب و روز پر قربان کرکے نہ بیٹھ رہتے تو صرف مجاز کی شاعری کی ضخامت ہی نہیں بلکہ ضخامت کے ساتھ اس کی رسیلی اور تند کیفیت بھی اور بڑھتی اور اس کی بدولت ہماری جدید شاعری کا قد و قامت اور اونچا، رنگ اور گہرا ہو جاتا۔

اب کفِ افسوس ملنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ اگر حاصل ہوگا تو مجاز کی موت سے عبرت لے کر "دماغی زہر" کی جانب جھکنے اور اس کی فضا پھیلانے سے کچھ حاصل ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۵٦)

شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں۔ للکارتے ہیں۔ سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ ان کے ذہن میں آمدِ انقلاب کا تصور طوفانی برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمہ ہزار اور رنگینیٔ بہار سے عبارت نہیں۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں۔ اس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و رعد کا دور مجاز پر بھی گذر چکا ہے۔ لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے ؎

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

تقدیر کچھ ہو، کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظرِ عشرتِ فردا اِدھر بھی آ

برق و رعد والوں میں یہ خلوص اور یقین تو ہے۔ یہ لوچ اور نغمہ نہیں ہے۔ ان میں انقلاب کی قاہری ہے دلبری نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی خوابِ سحر، اور نوجوان خاتون سے خطاب، اس دور کی سب سے مکمل اور سب سے کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں۔ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں، انقلاب کا مطرب ہے، اس کے نغمے ہیں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے۔ اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی!

ماتمِ یک شہرِ آرزو

شاعرِ جواں مرگ کی یاد میں ساتھی شعراء کی نظمیں ــــ

•

اور پھر نظموں کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا۔ اپنے جواں سال اور محبوب شاعر، ساتھی کی یاد میں بہت سے ساتھیوں کے ہاتھ سے درد و غم کے ساغر چھلک پڑے، شاہراہ کو اپنی تنگیٔ داماں کا شکوہ تھا۔ جی چاہتا تھا سبھی نظمیں پیش کر دی جائیں، مگر خلوص و عقیدت کے ان بے ساختہ جذبوں کو ہم نہ دے سکے جس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔

مجاز

شاعرِ حسن تھا شاداب تھی دنیا جس کی
"بسترِ مخمل و سنجاب" تھی دنیا جس کی
نازشِ کہکشِ شب تاب تھی دنیا جس کی
"ایک رنگین و حسیں خواب" تھی دنیا جس کی
ساتھیو آج وہ ہنگامہ کناں چھوٹ گیا،
شاہدِ بزمِ نگارانِ جہاں چھوٹ گیا!
وہ شہیدِ مے و مینا، وہ فنکارِ غمِ دل
اپنی بربادی پہ مسرور تو شہرت پہ خجل
قلقلِ بادۂ خوں ناب کی لے کا بسمل
جس کی خدمت میں لئے تحفۂ صد عظمتِ گل!
لیلیٔ حسن برافگندہ نقاب آئی تھی،
اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے خواب آئی تھی!
جس کے اشعار میں سنبل کی لچک گل کی مہک
جس کی آواز میں سوشیشۂ صہبا کی کھنک
جس کے افکار میں زخمِ دلِ انساں کی کسک
جس کی پیشانی پہ اک صبحِ تخیل کی دمک!
اپنے میخانے کا وہ میکشِ بے حال نہیں
ہاں وہی مردِ جواں بخت و جواں سال نہیں
ہائے یہ موت ہے اک رندِ خوش اطوار کی موت
اپنے اس دیس کے غربت زدہ فنکار کی موت
ایک جلتی ہوئی قندیلِ شرربار کی موت
دستِ جمہور میں اک شوخ سی تلوار کی موت
فرد کی موت نہیں قوم کا نقصان ہے یہ
بزمِ احباب میں بے لطفی کا عنوان ہے یہ
آج ہر ذہن میں انگارہ دہکتا ہوگا،
آج ہر دل غمِ فرقت میں سلگتا ہوگا
گلشنِ فکر کا ہر پھول فسردہ ہوگا
بزمِ تخئیل میں اک حشر سا برپا ہوگا
لالۂ و گُل اپنے سیہ خانے میں رو تی ہوگی
کوئی "نورا" کسی ویرانے میں روتی ہوگی

ہائے وہ حسنِ ترنم وہ تبسم وہ نکھار
اُف وہ مجروح جوانی وہ جگرسوز پکار
حیف وہ شدتِ احساس وہ جذبات وہ پیار
اُف وہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں
وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
(اجمل اجملی)

جامِ مجاز

جس جام نے برسوں ہمیں سرشار رکھا تھا
لو ٹوٹ گیا تندئ صہبا سے وہی جام
احساس کی شدت نے سنوارا جسے برسوں
کام آہی گیا آج وہ اک جذبۂ ناکام

جس شمع سے تھا محفلِ خوباں میں اُجالا
گل ہوگئی وہ شمعِ صد رنگ سرِ شام

وہ آج نہیں ہم میں مگر یاد نے اس کی
گوشہ میں ہر اک دل کے سجا رکھے ہیں اصنام
عارض ہیں کئی اب بھی اسی ذکر سے رنگیں
دھڑکن دلِ خوباں کی ہے اب بھی وہی اک نام
کہتے ہیں شکار اپنی ذہانت کا اُسے چند
کہتے ہیں کئی اُس کو قتیلِ مئے گلفام
دل ہو تو بہت ہے غمِ جاناں ہو کہ دوراں
کس کس پہ لگائیں گے ہم اِک مرگ کا الزام

کب سے وہ رہِ عشق میں سرگرمِ سفر تھا
کرنے دو ذرا دیر تو لوگو اُسے آرام
(شاہد عشقی)

قطعہ

مجاز! تیری نوا گونجتی ہے کانوں میں
مجاز! تیرے پیامات شمعِ جادہ ہیں
تو آج ہم میں نہیں، پر تری نوا کی قسم
کہ آج عزم و قویٰ کل سے بھی زیادہ ہیں
(رحمت امروہوی)

مجاز کے نام

لئے ہوئے نورِ فکر اپنا تم آج بزمِ جہاں سے نکلے
چراغ لیکن ہوائے رُخ پر جلا کے سوزِ نہاں سے نکلے
جنھوں نے خونِ جگر سے اپنے ہر ایک گل کو نکھار بخشا
خلش سے کانٹوں کی دامنِ دل بھرے ہوئے گلستاں سے نکلے
چراغ سے جن کے کل جہاں کی ہر انجمن انجمن بنی تھی
دھواں دھواں ہو کے آج آخر وہ محفلِ دوستاں سے نکلے
اسیرِ وہم و گماں نہیں ہو تو پھر یہ کیسا یقیں ہے آخر
کہ راہِ منزل کے پیچ و خم سے تم اس قدر بدگماں سے نکلے
سیاہ شب میں ہر ایک دل کو غمِ جدائی کا داغ دے کر
بُجھا کے اک شمعِ فکر تم بھی اُداس بزمِ جہاں سے نکلے
ہے دل کو سودائے حسنِ منزل، خیالِ شامِ سحر نہیں ہے
یقین کی رہبری میں راہی گمانِ سود و زیاں سے نکلے
(شعیب راہی)

میکدے کا نمازی

شاعرِ سحر کار و سحر طراز
اُٹھ گیا بزمِ شاعری سے مجاز
زیست کی کشمکش میں کام آیا
کارزارِ حیات کا جانباز
جس کے نغمے حیات پرور تھے
حیف خاموش ہوگیا وہ ساز
روح جس سے گداز ہوتی تھی
اب کہاں وہ نوائے روح گداز
جس کے شعر و سخن کے چرچے ہیں
اُس کے شعر و سخن کی عمر دراز
گیت کیا؟ اِک سرودِ خواب آور
نظم کیا؟ طبلِ جنگ کی آواز
اِک فسونِ ترنمِ الفاظ
شاعری، سر بسر مرقعِ ساز

پختگی حوصلوں کو دی جس نے
جس نے عزمِ جواں کو دی آواز
جس سے مانگی قدامتوں نے پناہ
جس نے اقدارِ نو کو دی تگ و تاز
کافرِ ناسپاسِ دیر و حرم
میکدے کا نمازئ ممتاز
وائے بر قسمتِ ادب مغموم
اُٹھتے جاتے ہیں شاعرِ ممتاز
(باوا کرشن گوپال مغموم)

یہ کس کا جنازہ اُٹھا

ایک کہرام ہے دُنیائے ادب میں برپا
دیکھنا آج یہ پھر کس کا جنازہ اُٹھا
لوگ کہتے ہیں مسافر تھا اندھیری شب کا
سُن رہا ہوں کہ کوئی شاعرِ آوارہ تھا
نذرِ دل لیکے بھٹکتا رہا جوں خانہ بدوش
اپنے سینے میں دبائے ہوئے طوفانِ خروش
جس نے تاریکی میں بھی خواب سحر کا دیکھا
جس نے تہذیب کی کھیتی کو لہو سے سینچا
راتدن تازہ "قیامت کا جنوں" تھا جس پر
"شہریاروں" سے رقابت کا جنوں تھا جس پر
تاجداروں سے عداوت کا جنوں تھا جس پہ
غم کے ماروں کی محبت کا جنوں تھا جس پر
بےخبر رہتا تھا طرقِ رہِ دُنیا شاید،
چل بسا، آج وہ، دُشوار تھا جینا شاید
اپنے گلشن میں بھی کہنے کو تو آئی تھی بہار
جس نے اونچا کیا ہر قطعۂ ویراں کا وقار
گر اک نئی شان سے گو جشنِ چراغاں بھی ہوا
اپنے ماحول کا اندھیارا گریزاں بھی ہوا
ہوتے ہوتے مگر اک روز یہ افسوں ٹوٹا،
راہزن بن گئے محافظ نے چمن کو لوٹا!

کل جھلستا تھا چمن برق و شرر سے اپنا
آج تو فصلِ بہاراں سے گلستاں دہکا
عندلیبانِ چمن نالہ کناں ہیں اب بھی
نرگس و سرو و سمن محوِ فغاں ہیں اب بھی
آج ہر پھول سے زخموں کی مہک آتی ہے
دِل میں گلگشت کی ہر آرزو مر جاتی ہے
گل فروشوں کا ہے ہر سمت چمن میں ڈیرا
نامرادی کا ہے ہر سمت وطن میں ڈیرا
اب بھی ہے شہ رگِ فنکار پہ ہر سمت چھری
اپنے ماحول غم انگیز کی اک کند چھری!
(نائل جمشید پوری)

چاکِ گریباں

وہ شہریارِ شہرِ نگاراں چلا گیا،
وہ اِک شہیدِ ابروئے خوباں چلا گیا
خیامِ عصر و حافظِ دوراں چلا گیا
اِک یادگارِ محفلِ رنداں چلا گیا
رنگِ سخن پریدہ، تخیّل دھواں دھواں
صد حیف اِک ترنّمِ رقصاں چلا گیا
اندوہ و غم سے لیلئ اُردو برہنہ سر
"تاجِ سخن کا لعلِ درخشاں چلا گیا"
بھڑکی تھی جس سے محفلِ شعر و سخن میں آگ
محفل سے وہ شرارۂ رقصاں چلا گیا
کل تک تھا بزم میں جو ہم آہنگِ "سازِ نو"
کرکے وہ آج بزم کو ویراں چلا گیا
وہ سرکش اور خودسر و خوددار چل بسا
ٹھکرا کے تخت و دولتِ سلطاں چلا گیا
لڑتا رہا جو سیلِ حوادث سے رات دن
ہو کر شکارِ گردشِ دوراں چلا گیا
کرتا رہا جو سب کا مداوائے درد و غم
وہ خود ہی آج چاکِ گریباں چلا گیا

جس سے کہ آشکار تھے اسرارِ زندگی
خود آج زندگی سے گریزاں چلا گیا!
(سعید اختر نعمانی)

مرنے سے پہلے، مرنے کے بعد

"رات اور ریل" میں لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ "غزل" اتنی نہیں — اور بھی گہری ہوتی
اور — "نورا" کے کئی شعر بہت عُریاں ہیں
وہ "فلاں نظم" ذرا اور بھی تیکھی ہوتی
کتنی بے معنی و بے ربط ہے یہ "آوارہ"
ایسی کیوں ہے —— یہ ذرا اور بھی ویسی ہوتی
بزمِ تہذیب میں وہ شخص ہے ننگِ محفل،
باغِ اخلاق میں اک خار بنا پھرتا ہے،
حلقۂ شعر و اَدَب میں نہ بلاؤ اس کو!
میزبانوں کے لئے بار بنا پھرتا ہے
گندگی سب پہ اُچھالے گا وہ ٹھرّا پی کر
اپنی اک نظم کا کردار بنا پھرتا ہے!
یہ، اور اس قسم کے کچھ اور بھی سطحی فقرے
لوگ کہتے رہے، کہتے رہے، کہتے ہی رہے
اور کوتاہ نگاہوں کی پہنچ سے آگے
وہ کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار
بزمِ احباب میں ہر لمحہ بنا باغ و بہار
دامنِ غم پہ بناتا ہی رہا نقش و نگار
وہ کہ اِس بزم میں رسوا سرِ بازار بھی تھا
وہ کہ اس دور کے "ہامان" سے لڑتا ہی رہا
اپنے ہاتھوں میں لئے ساغر و مینا کے کنول،
وہ کہ ظلمات کے "شیطان" سے لڑتا ہی رہا
اور پھر ٹوٹ گئی ربطِ ہستی کی لَے،
چند بے جان سی سانسوں کی حقیقت کیا ہے!
اس المیے کا سبب کون ہے؟ احباب کہ مے!
رشکِ صد ہوش جو مستی تھی وہ مستی نہ رہی
تھی جو چلتی ہوئی تلوار وہ ہستی نہ رہی
حیف وہ سادگیٔ زیست کی بستی نہ رہی
قوم چلائی — ہمیشہ یوں ہی چلائی ہے
اس کے مرنے سے بپا ہو گئی اک ایسی خلاء
سالہا سال بھی پُر ہو نہ سکے جو شاید،
فن کا معراج ہے اس شخص کی نظم "آوارہ"
"رات اور ریل" کے کیا کہنے — کرشمہ پارہ ہے
زیست کا آئینہ خانہ ہے ہر اک شعر اس کا
اُس کی مے نوشی تو اک پردۂ محرومی تھی،
اس کا کردار بڑا پختہ، بہت اونچا تھا،
کِتنا بے لوث وہ انسان تھا۔ کِتنا مخلص
عظمتِ زیست کا راز اس کے سوا کس کو ملا؟
جانے اس رسم کو کب دور کیا جائے گا
جانے فنکار کو کب جینے دیا جائے گا
(نازش پرتاب گڈھی)

مجاز کا پیغام

تری سرشت میں جو یہ اُمنگ کا شرار ہے
اسی سے زندگی میں آب و رنگ ہے بہار ہے
نزاعِ خیر و شر پہ زندگی کا انحصار ہے
بڑھے چلو کہ اصل زندگی تو اضطرار ہے
اُڑی وہ گردِ ناقۂ حبیبِ خوش اُدا مگر
اسی پہ بس نہ کر کہ تجھ کو جستجوئے یار ہے
عجیب سا یہ موسمِ بہار ہے کہ ہر طرف
چمن میں پھول پھول کا کلیجہ داغدار ہے
یہ تیرے غم کی وسعتیں کہ ابرِ کوہسار بھی
فراقِ دوست غم زدوں کی طرح اشکبار ہے
تو اپنے حال سے نہ ڈر، کہ تیرا حال بہتر ہے،
ترے گزشتہ عہد کی حسین یادگار ہے
زوال کا تو غم نہیں، اٹھو وگرنہ یہ زمیں،
نہ جانے ایسے کتنے حادثوں کی یادگار ہے
(عطا محمد شعلہ)

مرگِ مجاز پر

اسلوب میں تھا ندرتِ تخلیق کا خیال
ہر رنگ میں بھی تھا محاسن کا اہتمام
ہر حرف ایک حسنِ محبت کی داستاں
ہر لفظ زہرِ غم کا چھلکتا ہوا سا جام
ڈوبی ہوئی تھی خون میں حساس زندگی
ذوقِ سخن میں زندگیِ نو کا التزام
رومان و انقلاب کا اک امتزاج خاص
رنگِ بیاں میں تیرے نکھرتا رہا مدام
مجروح تیرے غم سے ہے بزمِ عزا کا دل
اب تک لبِ خموش کی زینت ہے تیرا نام
تو تلخیٔ حیات کا خمیازہ سنج تھا
بادہ کشی کا مفت لیا سر یہ اتہام
کچھ کہہ رہی ہے خاص اشاروں میں غم کی بات
تصویر غم بنی ہے ترے سوگ میں کلام
کانپا ہے تیری عزمِ بغاوت سے بارہا
سرمایہ داریت کا اجڑتا ہوا نظام
مزدور کی رگوں میں کیا تیز خونِ گرم
اپنی نوائے سوز سے تو نے کیا وہ کام
انفاسِ انقلاب میں بھر دیں وہ بجلیاں
جانبازِ انقلاب ہوئے اور تیز گام
(حاذق ناگپوری)

جنسِ گراں

برجِ شعر و ادب سے آج کی شب
اور اِک سُرخ ستارہ ٹوٹا
آج بے مایہ ہوئی بزمِ حیات
موت نے جنسِ گراں کو لوٹا!
(تسلیم گوالیاری)

مرگِ آوارہ

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ آ گئی نازک گھڑی
پھر کسی کی بیکسی داماں پسارے ہو کھڑی
"ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
ظلمِ فطرت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے
اک طرف مظلوم شاعر ہیں نظر کے سامنے
"سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
میں اگر چاہوں تو پھر مشکل ہے کیا میرے لئے
انقلاباتِ جہاں کے در ہیں وا میرے لئے
"پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
اے دلِ دردآشنا ساقی کے میخانے میں چل
ایشیا کے کیفِ رنگیں کا شانے میں چل،
"یہ نہیں ممکن، تو پھر اے دوست ویرانے میں چل"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
ضبط کے دامن کو چھوڑوں یہ مری عادت نہیں
صرف آنسو ہی بہاؤں یہ مری فطرت نہیں
"اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
آنکھ میں آنسو کا قطرہ ہے نہ چہرے پر ملال،
دل ہی دل میں "مرگِ آوارہ" کا چبھتا ہے خیال
"آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے دل کا حال"
"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں"
(مضطر حیدری)

احتشام حسین

جوانی کو کفن

شمشیر، ساز اور جام، نہیں بلکہ جام، ساز اور شمشیر، کی علامتوں کے پردے میں زندگی سے اور انسان سے محبت کرنے والا مجاز اپنے تمام محبوب تصورات، محبوب دوستوں، آشنا نا آشنا قدر دانوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ موت دہ رات کے پردے میں وار کر گیا اور اسے ہم سے چھین لے گئی۔ موت مجاز کی محبوب علامت جام بن کر آئی اور مجاز نے اُسے گلے لگا لیا۔ اس کا کمزور اور نحیف جسم لیکن اس کی توانا اور جوان روح نے موت کو لبیک کہا۔ زندگی اُسے بلاتی رہی، اس کے دوست اسے روکتے رہے۔ زندگی اسے ساز دیتی رہی لیکن نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا کہ اُسے موت کی آواز پسند آئی اور اس نے سب کچھ چھوڑ کر کار زارِ حیات سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیا اس نے کہا تھا — ع مجھے جانا ہے اک دن تری بزمِ ناز سے آخر — اور وہ اس بزمِ ناز سے چلا ہی گیا — اس نے کہا تھا ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے، سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے، موت آواز دے رہی ہے مجھے

اور نہ جانے موت نے کس طرح سرگوشی کی کہ صرف اس نے سُنا اور اس کے ساتھ نہ جانے کن تاریک اور روشن وادیوں میں چلا گیا۔ اس نے کہا تھا ؎

ضعیفی محفلِ عشرت میں خرقہ پوش آتی ہو جوانی جب بھی آتی ہو کفن بردوش آتی ہو

اور اس نے جواں مرگی کی یہ ریت پوری کی۔ جواں مرگی اور شاعری کی ریت — عرفی، شیلی، کیٹس، بائرن، چیٹرٹن، ہیونی، کاڈول، فاکس نے بھی پوری کی تھی۔ معلوم نہیں کہ شاعر کا دل موت کے قدموں کی چاپ سُنتا ہے یا نہیں۔ لیکن مجاز اسے ضرور سن رہا تھا۔ پرسوں اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ مجھے یہ ملنا آخری ملنا معلوم ہو رہا ہے۔ کسی نے وطن کا ذکر کیا تو اس نے فانی کا یہ شعر پڑھا — ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

معلوم نہیں یہ باتیں اس سے کون کہلا رہا تھا۔ اس کے دوستوں کے دل اس کی زبان سے موت کا لفظ سن کر دہلتے تھے۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اُدھر چند دنوں میں اتنا خوش و خرم تھا کہ شاید موت اس کے پاس آتے ہوئے ہچکچائی ہوگی — اس نے موت کو کیوں اور کیسے گلے لگایا — یہ دکھ بھری کہانی بار بار اور بہت دنوں تک کہی جاتی رہے گی۔ لیکن مجھے اس رات اس کی میت کے قریب کھڑے کھڑے یہ رباعی یاد آ رہی تھی :—

وقت کی سعیِ مسلسل کارگر ہوتی گئی، زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی!!
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

اور کل وہ آہٹ اتنی تیز ہو گئی کہ سازِ حیات کی گونج اس میں ختم ہو گئی۔

مجاز کا نام اسرار الحق تھا۔ ان کا وطن اودھ کے مشہور قصبے ردولی میں تھا۔ جہاں وہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ مستقل لکھنؤ میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ پھر آگرہ اور علی گڑھ کا رُخ کیا۔ وہاں سے بی۔ اے کرنے کے بعد مجاز آل انڈیا ریڈیو کے دلی اسٹیشن پر ملازم ہو گئے اور آواز کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ان کے اندر جو بے چین اور بے قرار روح تھی، ملک و قوم کی خدمت کا جو جذبہ تھا اور ایک بیرونی حکومت کا پیدا کیا ہوا جو ماحول تھا اس نے انہیں وہاں ٹکنے نہ دیا اور تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں ہر نوجوان خوابوں اور خیالوں میں ایک انقلابی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یہ خواب کبھی کبھی حقیقت بھی بنتے تھے اور نوجوان آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں کود پڑتے تھے۔ مجاز اور ان کے ساتھی قومی اور انسانی درد سے معمور دل رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم کی نوک اپنے خونِ دل میں ڈبو لی تھی۔ جوانی کو کفن پہنا لیا تھا اور اندھیری رات کے مسافر کی طرح جدوجہد حیات کے راستہ پر چل پڑے تھے۔

مجاز کی رنگیں نوائی، خوش بیانی، فکری شگفتگی، روایت اور نئے پن میں بسی ہوئی آواز، رومان اور انقلاب سے ہم آہنگ گیت ان کی طالبعلمی کے زمانہ ہی میں شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اور وہ بہت سے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ جب ہندوستان کی جدوجہد جوان ہو گئی تو مجاز کی شاعری اور شعور کا بھی شباب تھا۔ اس لئے ان کا کلام پڑھنے والے کو ہمیشہ یہ محسوس ہوگا کہ وہ ہندوستان کے شباب کی علامت تھے۔ جسے محبت کی تلاش تھی اور نہیں ملتی تھی، جسے ڈگریوں کی تلاش تھی اور وہ میسر نہ تھیں۔ جسے گھر کے سکون کی خواہش تھی اور وہ نایاب تھا۔ جسے تہذیبی زندگی کے حسن کو سمیٹ لینے کا ارمان تھا اور اس کی راہ میں روڑے تھے۔ جسے زندگی کی برکتیں حاصل کرنے کی تمنا تھی اور وہ اس سے دور بھاگ رہی تھیں ــــ ہندوستانی نوجوان کی زندگی کے یہ خواب اور یہ حقائق مجاز کی شاعری کا موضوع بن گئے اور انھوں نے رومان اور انقلاب کو ملا کر اس نئے گیت کو جنم دیا جو وقت کی آواز بن گیا۔

مجاز کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ شمشیر، ساز اور جام کا ذکر کیا گیا ہے اور میں نے بھی یہ غیر مربوط خیالات انھیں الفاظ سے شروع کئے ہیں کیونکہ یہ الفاظ اپنے مخصوص تصورات کے ساتھ مجاز کو بھی عزیز تھے۔ انھیں میں ان کی شاعری کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا راز تھا اور انھیں میں اس کی روح کی پکار تھی۔ یہ تصورات اپنے عہد سے مجاز کے دل سے اور ہزارہا نوجوانوں کے خیالات سے اس قدر ہم آہنگ تھے کہ انھوں نے غنائیت اور مستی کا عمل پیدا کر لیا تھا۔ پھر یہ خیالات آہستہ آہستہ وسیع ہو کر آفاقی شکل اختیار کرتے گئے۔ اور محبت، سیاست، لذت کوشی، انسان دوستی اور شعریت کا ایک ایسا مرکب تیار ہو گیا جسے صرف ایک غیر معمولی فنکار کیمیاوی تحلیل کے ساتھ پیش کر سکتا تھا۔ یہی فنکارانہ قدرت تھی جس نے مجاز کی شاعری کو منفرد بنا دیا تھا۔

تو اس مجاز نے ایک رات چھیالیس سال کی عمر میں ہمیں الوداع کہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کی توجیہ کس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس کے مرتے وقت اس کے عزیز ترین دوست اور قدردان اس کے سرہانے کھڑے تھے اور وہ مجاز جو ہر مجلس اور ہر محفل کو اپنی شگفتہ بیانی سے گلزار بنایا کرتا تھا اس طرح خاموش تھا کہ کوئی التجا اور کوئی آہ و زاری اُسے کسی طرف ملتفت نہیں نہیں کر سکتی تھی۔ اُس کے قریب سجاد ظہیر تھے جن سے اُسے غیر معمولی محبت تھی عصمت چغتائی تھیں جو ایک دوسرے سے دلی وابستگی رکھتے تھے، سردار جعفری تھے جن کی محبت کی تھاہ کوئی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ ساحر لدھیانوی تھے جو اسے بے حد عزیز تھے حیات اللہ انصاری تھے جن سے اُسے گہرا ربط تھا۔ نیاز حیدر تھے جو اس کے محبوب دوستوں میں تھے۔ سب دبے پاؤں چل رہے تھے۔ سب خاموش تھے۔ سب اس کی سانسوں کا بگڑتا ہوا نظام دیکھ رہے تھے اور سب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن اس نے کسی کی طرف رخ نہیں کیا۔ ایک شب پہلے مجاز پر فالج کا اثر ہوا۔ دن میں جب اسپتال پہنچائے گئے تو ان کے دماغ کی رگیں پھٹ چکی تھیں۔ دوا اور دعا کوئی چیز کارگر نہیں ہوئی۔ مجاز اسی راستے پر چلے گئے جس پر اردو شاعروں اور ادیبوں میں میر عبدالحی تاباں۔ درگا سہائے سرور۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ بنواری لال شعلہ۔ اختر شیرانی۔ سعادت حسین منٹو گئے تھے۔ اردو کے عظیم الشان شاعر اپنے دوستوں

اور قدر دانوں کا سلام لے! موت تیری گھات میں تھی تجھے لے گئی۔ لیکن زندگی بھی موت سے انتقام لینا جانتی ہے —— وہ تجھے مرنے نہ دے گی۔ وہ تیری شاعری کو بقائے دوام بخشے گی۔ تیرا جسم مٹی کا تھا مٹی میں مل جائے گا۔ تیرے نغمے انسانوں کی ملک ہیں جب تک انسانوں کے دل دھڑکتے ہیں تیرے نغمے انھیں اضطراب کی دولت سے مالا مال کرتے رہیں گے اور تو زندہ رہے گا۔

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

وقار عظیم

مُطربِ بزمِ دِلبراں

مجاز وہ شاعرِ محفلِ وفا، وہ مطربِ بزمِ دلبراں اور وہ کہ جس کے جنوں کی داستاں برسوں دفترِ شہریار کی رنگینی کا سامان تھی — آج ہم سے رخصت ہوگیا — مجاز نے نوعِ انسانی کی پرستاری کو اپنا شعار بنایا تھا آج حور و غلمان کا ہم نشین ہے۔ اور ہم چند یادوں کے سرمائے کو سینے سے لگائے اسے آہستہ آہستہ، اپنی مخصوص شان بے نیازی سے ایک دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کی طرف جاتے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی کے کٹھن سے کٹھن سفر کو اسی آہستگی اور اسی شانِ بے نیازی سے آسان بنا لینا مجاز کی عادت تھی ۔

مجاز کی اس عادت کا ذکر میں نے دوستوں سے بار بار سنا تھا اور اس کی بڑی دلکش اور دل نشین تصویر اس کے کلام میں دیکھی تھی اور میرے لئے اس کی اس شخصیت میں جو بیک وقت رومان کے نغموں اور انقلاب کے گیتوں کا مرکز تھی ایک غیر معمولی کشش تھی۔ میری زندگی کا بہت سا حصہ لکھنؤ اور علی گڈھ میں گذرا ہے۔ لیکن اتفاق ہے کہ جب مجاز کے —— رومان کے نغمے اور انقلاب کے نعرے ان دونوں شہروں کے کوچہ و بازار میں گونج رہے تھے میں وہاں نہیں تھا۔ یوں دور رہتے ہوئے ان نغموں کی شیرینی اور ان نعروں کی تاثیر نے دل میں اپنی جگہ بنا رکھی تھی اور جی برابر چاہتا تھا کہ مجاز کو قریب سے دیکھوں۔

یہ تمنا ۱۹۴۲ء میں پوری ہوئی، لیکن ایک عجیب انداز سے۔ میں کسی کام سے دہلی ریڈیو اسٹیشن گیا تھا۔ اس وقت تک ریڈیو اسٹیشن نئی دہلی والی شاندار عمارت میں منتقل ہو چکا تھا۔ جس کمرے میں مجھے کام تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ ایک دبلے پتلے صاحب (جنھیں دیکھتے ہی آدمی فوراً یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شاعر ہیں) میز پر بیٹھے کسی چیز کی نقل کر رہے ہیں۔ میں نے انھیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ مجھ سے واقف تھے اس لئے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو ایک ہلکی سی جنبش کے ساتھ پیچھے کرکے پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ جن صاحب کے کمرے میں میں ابھی داخل ہوا تھا۔ انھوں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ اس لئے تعارف کرانا ضروری سمجھا۔ اور صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئے —— مجاز، وقار عظیم۔

مجاز صاحب کا نام سنتے ہی وہ ساری تصویریں ذہن میں پھر گئیں جو ان کے شعر اور ان کی طرح طرح کی باتیں سُن کر تصور نے بنا رکھی تھیں وہ رنگینی جو اسے بزمِ خوباں کا محبوب بناتی تھی اور وہ نعرۂ انقلاب جو اربابِ سیاست کے دلوں کو دہلا دیتا تھا میری ذہنی تصویر میں ان دونوں چیزوں کا بہت لطیف امتزاج تھا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ تصور اور حقیقت کی تصویریں —— ایک دوسرے سے

کتنی مختلف ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی لمحہ میں ہوا۔ اس ایک لمحہ میں مجاز کی نگاہیں اوپر اٹھ چکی تھیں۔ ان کا چہرہ متبسم تھا اور ان کا وہ ہاتھ جس میں اب بھی پنسل دبی ہوئی تھی میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ انتہائی نرمی سے انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "گدڑی کے لعل!" اور پہلے سے بھی زیادہ مسکرا دئے۔ میں کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا تو بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "مزدوری کر رہا ہوں!"

فوراً ہی یہ دونوں فقرے اس طرح حل ہو گئے کہ ہارڈنگ لائبریری والے فصیح الدین مرحوم نے مجاز سے اپنے پرچے ادیب کے لئے میری وہ تقریر نقل کروائی ہے جو میں نے ریڈیو والوں کے لئے "عظمت اللہ دہلوی" تقریروں کے اس سلسلے میں لکھی تھی جو "گدڑی کے لعل" کے نام سے انھوں نے شروع کر رکھا تھا۔

مجاز ان دنوں فصیح صاحب کے ساتھ ان کے نائب کی حیثیت سے شاید سو روپے مہینے پر کام کر رہے تھے اور لائبریری کے بعض دوسرے کاموں کے علاوہ "ادیب" کی ترتیب میں ان کی مدد کرتے تھے۔

مجاز اپنا کام چھوڑ کر مجھ سے دیر تک طرح طرح کی باتیں کرتے رہے اور اس بے لوث سادگی اور خلوص سے کرتے رہے کہ کسی دیکھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ ہم دونوں کی پہلی ملاقات ہے۔ اس ملاقات میں میں نے دو باتیں بڑی شدت سے محسوس کیں —— ایک یہ کہ زندگی نے مجاز سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ شباب کی رعنائی اور حسن۔ اور انقلاب کا جنون و دیوانگی۔ لیکن خود مجاز نے اب بھی کسی نہ کسی طرح ان دونوں شعلوں کو روشن رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے جسم میں خون کے جو چند قطرے باقی رہ گئے تھے ان سے وہ اب بھی حسن کو شاداب رکھنے اور انقلاب کو سینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری بات جس نے اس پہلی ملاقات میں میرے دل کو متاثر کیا یہ احساس تھا کہ مجاز کے خلوص کے نزدیک محبوب کی زلفیں سنوارنے، انقلاب کا پرچم اونچا رکھنے، مزدوری کرنے اور مسکرانے میں کوئی فرق نہیں۔ ہر وہ چیز جس کی پرورش خلوص اور صداقت کی آغوش میں ہوتی ہے زندگی کی شمع کو روشن رکھنے میں یکساں اہمیت رکھتی ہے اور انسان اسے چھوٹے اور بڑے کے امتیاز کے بغیر اپنا آدرش بنا سکتا ہے۔

اس ملاقات کے بعد ہارڈنگ لائبریری میں مجاز سے کئی مختصر ملاقاتیں ہوئیں اور ہر ملاقات کے ساتھ مجاز کے متعلق کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم یا محسوس ہوتی رہی —— مجاز کی زندگی میں بہت دکھ ہیں، اور غم جاناں اور غم دوراں دونوں ان کا مرکز و محور ہیں۔ ہر دکھ انھیں اندر ہی اندر سلگا رہا ہے۔ بعض لوگوں کی صحبت نے انھیں غموں کی آگ کو آتش سیال کے نیچے دبا رکھنے کا عادی بنا دیا ہے اور ان کی اپنی بے نیازی نے اس ساری آگ پر تبسم کا پردہ ڈالے رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ دنیا کے غم انسان کی عظمتِ کردار کی کسوٹی ہیں اور انھوں نے مجاز کی شخصیت کے کندن کو اور چمکا دیا ہے۔

دہلی میں مجاز سے یوں ہی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ چاندنی چوک کے ایک ریسٹوران میں، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، ریڈیو کے کسی پروگرام میں، شاہد صاحب کے گھر پر اور کبھی کبھی سرِ راہے۔ ان ملاقاتوں میں برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ کبھی نہ ختم ہونے والے غموں میں اور مجاز میں ایک مسلسل کشمکش جاری ہے اور غم مجاز کے ارادوں کی مضبوطی پر غالب آتے جا رہے ہیں۔ شراب کا جھوٹا سہارا برابر بڑھ رہا ہے —— لیکن مجاز کا تبسم اب بھی ان کا مستقل مونس و جلیس ہے اور ان کے غموں کی پردہ پوشی میں ان کا سب سے بڑا مددگار۔ مجاز غموں کی اس مسلسل اور مستقل کشمکش اور جنگ میں بھی ہنستے رہنے اور دوستوں پر ایسے فقرے چست کرنے کو اپنا معمول جانتے ہیں جن پر اچھے سے اچھے ادب کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ مجاز کے دوست احباب ان کے تبسم اور ان کی پھبتیوں میں برابر ان کے شریک ہوتے رہے —— اور پھر کچھ یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجاز کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اور پھر ایک دن کسی نے کہا کہ مجاز سخت بیمار ہیں اور ڈاکٹروں نے ملاقاتوں کی قطعی ممانعت کر رکھی ہے —— اس دوران میں جس جس سے مجاز کا ذکر آیا اس نے ان کی زندگی کی طرف سے مایوسی کا اظہار کیا۔ میں جب کسی سے اس طرح کی کوئی بات سنتا تو میرا دل بیٹھ جاتا اور اپنی افسردگی کو ہمیشہ مجاز کے شعر گنگنا کر دور کرنے کی کوشش کرتا۔ دورِ جدید کے شاعروں میں مجھے مجاز سے زیادہ نغمگی کسی اور کے شعر میں نظر نہیں آتی۔

مجاز کی بیماری کے متعلق گوناگوں خبروں کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک یوں ہی جاری رہا —— اور پھر ایکا ایکی تھم گیا —— اسی دوران میں ایک دن

دو بجے کے قریب ایکایکی مجاز دہلی پالی ٹکنک میں آ گئے جہاں میں ان دنوں پڑھاتا تھا - انھیں خلافِ توقع وہاں دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی لیکن مجھے ابھی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اور پڑھانا تھا - اس لئے مجاز کے لئے ان کی فرمائش پر سگریٹ کی ایک ڈبیہ منگا کر میں پڑھانے چلا گیا - کوئی سوا گھنٹے بعد واپس آیا تو مجاز برآمدے میں ٹہل رہے تھے سگریٹ ان کے منہ میں تھا - میں نے یہ محسوس کیا کہ میری غیر موجودگی میں وہ برابر سگریٹ پیتے رہے ہیں اور ڈبیہ میں اب صرف تین سگریٹ باقی ہیں - مجھے دیکھتے ہی بولے کہ "آج شام کا کھانا میں تمہارے ساتھ کھاؤں گا" میں نے کہا "ٹھیک ہے" اُن دنوں میری بیوی علیگڈھ گئی ہوئی تھیں - اس لئے ہم دونوں نے کشمیری دروازے کے ایک ہوٹل میں چائے پی - چائے پیتے وقت مجاز برابر خاموش رہے - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس وقت وہاں نہیں ہیں —— چائے کی پیالی ختم ہوئی تو جیسے چونک کر بولے "اب چلیں" میں نے کہا "ہوں" اِس وقت تک وہ تینوں سگریٹ بھی ختم کر چکے تھے - باہر نکل کر ایک پنواڑی کی دکان کا رخ کیا اور وہاں سے اصرار کر کے سگریٹ کے بجائے بیڑی کا بنڈل خریدا - فوراً ہی بس مل گئی اور ہم دونوں تیما پور پہنچ گئے - گھر پہنچتے ہی کہا کہ "یار ہم نہائیں گے" میں نے ایک کرتہ پاجامہ نکال کر دیا وہ نہا کر کچھ دیر بیٹھے بیڑی پیتے رہے اور پھر جیسے چونک کر بولے "میں ابھی آیا" میں نے پوچھا "کیوں کہاں جاؤ گے؟" کہنے لگے "بس یوں ہی" یہ کہہ کر باہر نکل گئے اور کوئی ساڑھے دس بجے لوٹ کر آئے - بولے "بڑی دیر ہو گئی - لاؤ کھانا کھائیں" ہم نے کھانا کھایا - کھانے کے دوران میں بڑی لطیف باتیں کرتے رہے - پھر لیٹ کر بیڑی پینے لگے اور تھوڑی دیر میں سو گئے - جب میں سو کر اٹھا تو دیکھا کہ ان کا پلنگ خالی ہے - نوکر نے بتایا کہ "میاں تو بہت سویرے ہی اُٹھ کر کہیں چلے گئے تھے" —— میں نے ناشتہ پر انتظار کیا جب وقت بہت تنگ ہو گیا تو ناشتہ کر کے اسکول چلا گیا - واپسی پر معلوم ہوا کہ مجاز لوٹ کر نہیں آئے —— بڑی الجھن رہی - اس کے کئی مہینے بعد کہیں سڑک پر ایک سرسری سی ملاقات ہوئی - ان کی پریشان حالی کو دیکھ کر میں نے اس دن کے غائب ہو جانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا —— تقسیم سے پہلے یہ میری اُن کی آخری ملاقات تھی -

میں پاکستان آ گیا - یہاں مجاز کے متعلق برابر خبریں ملتی رہیں - اب لکھنؤ میں ہیں - اب دلی - اب بمبئی میں ہیں - اب بیمار ہیں - اب اچھے ہیں - اب شراب کم کر دی ہے - اب شراب چھوڑ دی ہے - اب شراب بہت پیتے ہیں - اب ہوش و حواس معطل ہیں - اب زندگی کی کوئی امید نہیں —— اور ایک دن کسی نے یہ کہہ دیا کہ "مجاز مر گئے" اس خبر سے دھکا لگا - لیکن پھر سوچا کہ مجاز اب زندہ رہ کر ہی کب زندہ تھے - لیکن تھوڑے دن بعد ریڈیو کے ایک پروگرام میں مجاز کو غزل پڑھتے سُنا - آواز میں بڑی لڑکھڑاہٹ تھی —— یقین ہو گیا کہ انقلاب کی دعوتیں دینے والا مجاز خود انقلاب کا شکار ہو گیا - زندگی نے اس کے قدم ڈگمگا دیئے - اور اس کے گلے سے یہ نکلی ہوئی لڑکھڑاہٹ اسی کی صدائے بازگشت ہے - کتنا روح فرسا تھا یہ تصور -

پھر مجاز پاکستان آئے — بظاہر اچھے تھے - لیکن زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی - وہ ہر طرح اس کے شکنجوں میں کسے ہوئے تھے — دیکھ کر اور مل کر بے حد رنج ہوا — مجاز ہندوستان لوٹ گئے اور حیات و موت کی ایک مسلسل جنگ شروع کر دی - کئی مرتبہ موت اُن کی بالیں تک آئی اور الٹے پیر پھر گئی اور بالآخر آج سُنا کہ مجاز مر گئے - مجاز کی موت کی خبر پڑھ کر خیال آیا کہ ایسے معصوم اور بے ضرر لوگوں پر کمند پھینکنے سے موت کو کیا مزا آتا ہوگا؟ لیکن فوراً اس سوال کا جواب بھی مل گیا - "موت تو کسی کو بھی نہیں چھوڑتی —— البتہ جس ڈھیل ضرور دیتی ہے - انسان اور انسانیت کا گلا گھونٹنا جن کا شعار ہے اور پھر اس ڈھیل کے بعد انھیں اس طرح اپنے شکنجے میں کستی ہے کہ دیکھنے والوں کو عبرت ہوتی ہے -

باقی رہنے والا تو صرف ایک نام ہے اور یا انسان کے وہ کام جو اس نے خدا کے بندوں کی بھلائی کے لئے کئے - اچھی شاعری کے ذریعہ انقلاب کی راہ دکھانا بھی اسی طرح کا ایک کام ہے اور یہ کام مجاز کو زندہ رکھے گا -

عصمت چغتائی

عشقِ مجازی

ویسے میں مجاز کو بہت کم جانتی ہوں، میرا مطلب ہے میں اصل مجاز سے زیادہ وہ مجاز ان کی شاعری میں ڈھونڈ کر پاتی رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ پہلی میری ملاقات ان کی شاعری سے ہوئی اور پھر جب میں خود شاعر سے ملی تو میں نے انھیں ویسا ہی پایا جو اشعار نے بنایا تھا۔ میں نے مجاز کی شخصیت میں بھی اپنے زمانہ کے تمام مجاز ہی دیکھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مجاز تنہا نہیں وہ اپنے وقت کے سارے دکھوں، الجھنوں، بندشوں اور رکاوٹوں کے خلاف پکارتا ہوا اُٹھا اور خوب اٹھا۔ پر نہ جانے منہ کے بل کیوں آرہا۔

جھوٹ سچ کا عذاب راوی کی گردن پر مگر سنتے ہیں کہ اُڑان کے زمانے میں کہیں ایسے بے موقع پھسل پڑے تھے کہ توبہ بھلی۔ یعنی کہیں بالکل شجرِ ممنوعہ قسم کی محبوبہ پر پھسل پڑے۔ جو اپنی آبائی مجبوریوں کے ساتھ عشق کے میدان میں تو اتر آئی مگر بزنس کے میدان میں رہ گئی۔

اور یہی ہے بھی سچی بات کہ عشق تو اندھا ہوتا ہے۔ پر قاضی اندھے نہیں ہوتے۔ خیر تو نہ جانے کیا بیتی۔ چہرے کی بجھی بجھی سی چنگاری بتاتی ہے کہ کچھ مزے کی نہیں بیتی۔ چہ، یہ نوجوان!

ویسے تو آسمان سے ستارے نوچ لائیں گے، ابھی ایک نہیں سارے۔ تختِ سلطان تو کیا سارا قصرِ سلطان پھونک دینے کی دھمکی دیں گے۔ یعنی پورے تیس مار خاں۔ لیکن جو ذرا میدانِ عشق میں تنکا بھی لگ گیا تو چت، فوراً لمبے لمبے لیٹ جائیں گے۔ اور کریں بھی کیا بے چارے۔ صدیوں کی روایتیں اور افسانے یہی تو سکھاتے ہیں کہ دنیا میں عشق کے سوا اور سب فضول ہے۔ زندگی کا پہلا اور آخری مقصد یہی تو ہے کہ جھٹ پٹ موقع بے موقع کسی سے عشق میں مبتلا ہو جاؤ۔ اگر کامیاب ہو گئے تو سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھو۔ پھر بچوں، ننگوں کی تعداد بڑھانے پر ٹوٹ پڑو۔ اگر ناکام رہے تو پھر کیا فکر ہے، پاگل ہو جاؤ۔ مزے سے برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔

خیر جی، کون کہتا ہے عشق نہ کرو۔ جوانی اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مگر آج کل کے نوجوان تو عشق بھی سلیقے سے کرنا نہیں جانتے۔ پہلے زمانہ میں تو لوگ عشق کیا کرتے تھے اور بس کئے چلے جاتے تھے۔ پر آجکل کے عاشق کچھ عجیب قسم کی معجون ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ مرضِ عشق ہی میں مبتلا ہیں یا ہزاروں روگ ہیں جنھیں عشق کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔ اور مجاز جو کہ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہندوستان کے اس [illegible] طبقہ کے نوجوانوں کے نمائندے ہیں جو زندگی کے سارے جھمیلوں بندشوں اور رکاوٹوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی جی توڑ کر ان سے کشتم کشتا کرتے رہے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے یہ کانٹے چبھتے ہیں اور اُن کی نوک پر وہ اپنا سینہ ٹیک دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے یہ لوگ کیا جانیں سلیقے سے عشق کرنا۔ کون جانے وہ عشق ہی یا دنیاوی ڈھکوسلوں کے خلاف جہاد جو مجاز کے دل میں شعلہ بن کر بھڑکا۔ ہوش آتے ہی مورچہ بندی شروع ہو گئی ہوگی۔ پہلی جنگ تو خود اپنے گھر کی گورنمنٹ سے، خود اپنے جائز حقوق کے لئے بھی بہنوں کو لڑ لڑا کر اسکول بھجواتا۔ ان کی شادیاں کہاں اور کیسے ہوتی ہیں۔ اس کا

سوچا بچار کرنا۔ اگر اس اونچائی سے محاذ پر پیچھے ہٹنا پڑے تو یہ سمجھئے کہ آنے والی فتوحات بھیانک شکستیں ہی نظر آئیں گی۔ بھلا جب اپنے ہی گھر پر جالے تنے ہوں تو دوسروں کے گھر پر کس منہ سے جھاڑو دے کر جائیں۔ مگر خوش قسمتی سے مجاز کے والدین ان گنتی کے چند لوگوں میں سے ہیں جو منہ کا نوالہ بچوں کو تعلیم دلا دیتے ہیں۔

دوسرا محاذ کالج اور یونیورسٹی کے قوانین کے خلاف قائم ہوتا ہے جہاں آج جرمانہ تو کل رسٹیکیشن پر نوبت پہنچی ہوئی ہے۔ چال ڈھال پر بندش، بول چال پر بندش۔ اور جب زندگی میں یوں چاروں طرف ٹانگ گھسیٹی جا رہی ہو تو کوئی کیا تو عشق کرے اور کیا عاشقانہ شاعری۔ وہ زمانے تو لد گئے جب شاعر مزے سے عشق کرتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔ اور اب تو عشق کی گردن میں پولیس کا ڈنڈا اٹکا ہے۔ ہاتھ روٹی میں الجھے ہوئے ہیں۔ پیر غلامی کی زنجیروں میں گھسٹ رہے ہیں۔ ایک نہیں سو ہزار آسیب جان کو چمٹے ہوئے ہیں اور حساس طبیعت ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہیں۔ ایسی صورت میں اگر شاعری بجائے حسن و عشق کے معجون مرکب نہ بن جائے تو اور کیا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاز کے یہاں عشق سیاست باہم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھلا زندگی میں جب اتنی مجبوریاں ہوں تو کوئی کیونکر جئے۔ ایسی صورت میں

"کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے"

پر ایسا ہوتا تو رونا ہی کا ہے کا تھا بھلے ہی دن نہ تھے؟
ساز چھوڑنے پر کون تیار ہے وہی مرغے کی ایک ٹانگ

"لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری عادت نہیں"

پھر بھی مجبوریاں اور لاچاریاں ضدیں بن گئیں۔ چار دن کی ریڈیو کی نوکری ختم ہو گئی۔ منہ پر تماچہ سا لگا۔

"کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علیگڈھ کی ہزاروں محفلیں!"

اور اب کہ .....

"آہ تیرے میکدہ سے بے پئے جاتا ہوں میں"

مگر چلتے چلتے باز نہیں آتے۔

"پھر تری بزمِ حسیں میں لوٹ کر آؤں گا میں"

ایسے ویسے نہیں بڑی دھوم دھام سے۔

"سر سے پا تک ایک خونیں راگ بن کر آؤں گا"

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ مجاز کو واقعی سیدھا سادھا عشق ہوا تھا یا یہ بھی اس کا وہی خواب تھا جو آج کل کا بیشتر نوجوان سوتے جاگتے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے۔ پر تعبیر نہیں ملتی۔ وہ گھر میں گوشت پوست کی چاندی سی دلہن ہی لانا چاہتا ہے۔ یا دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی سے ڈھالنے کی خواہش کو دلہن کا روپ دے دیا ہے اس کا عشق تو کچھ اس طرح اس دنیا اور اس کے نظام سے چپکا ہوا ہے کہ وہ اسے جدا ہی نہیں کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی گھر بھی چاندی سی دلہن کے پر نور مکھڑے کی دمک سے روشن نہیں ہو سکتا جب تک ملک پر سے یہ بھیانک بیوگی دہشت ہٹائی جائے گی۔ ایک ہی سانس میں وہ محبوب کے رخساروں کی تابانیوں کے نغمے بھی گاتا ہے اور ان گھنگھور گھٹاؤں کا ذکر بھی کرتا ہے جو اس کے رخ روشن پر چھائی ہوئی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ چاروں طرف لٹکتے ہوئے ورثاتا لے اس کی سانس گھونٹے دیتے ہیں۔ دانت پیس کر وہ ان پر ہتھوڑے مارتا ہے۔

ایک چیز جو مجاز کے یہاں پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے شاعر میں اتنی واضح اور اُبھری ہوئی نہیں ہے۔ محبوب اور عورت کا تصور بھی انوکھا اور اصولِ شاعری سے ہٹا ہوا ہے۔ پرانی شاعری میں محبوب حسن و جمال کی پوٹ ہوتا تھا۔ اس کے اپنے چند مخصوص حربے ہوتے تھے اور چند انداز جو وہ وقتاً فوقتاً استعمال کرتا تھا۔ مگر اس کے سارے انداز نہایت اجنبی سے معلوم ہوتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آیا معشوق ہی کا ذکر ہے یا کسی جابر اور قہار شہنشاہ کا ذکر ہے جسے عشقیہ غزل میں سمو دیا گیا ہے اور پھر میں سوچتی ہوں کہ کبھی یہ شاعر ترقی پسند ہوں گے۔ مگر بے چارے شہنشاہ کے خوف سے کچھ نہ کہہ پاتے ہوں گے پردل کی بھڑاس نکالنے کو معشوقاؤں کی آڑ میں سب کچھ کہہ گئے۔ غرض ان کے یہاں سوائے خوبصورت زبان اور تشبیہات کے انسانی حسن کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز وہ شاعر ہے جس کی محبوبہ اسی دنیا کی عورت ہے۔

"میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے" اس دنیا کی عورت یہی جسے آپ چلتا پھرتا روز دیکھتے ہیں۔
یہی نہیں مجاز نے عورت کو پہلی بار عورت ہی نہیں کہا بلکہ اسے نکتہ داں بھی بنا دیا حسن کے ساتھ ساتھ۔

"مجھے حیران کر دیتی ہیں نکتہ دانیاں اس کی"

اور بجائے خونِ دل پلانے اور لختِ جگر کھلانے کے اچھی خاصی آدمیت کی باتیں کرتی ہے .... اور ......

مرے چہرے پہ جب بھی فکر کے آثار پائے ہیں،
مجھے تسکین دی ہے، میرے اندیشے مٹائے ہیں

لیکن یہ کیا کہ

کوئی میرے سوا اس کا نشاں پا ہی نہیں سکتا،
جھلکتی ہیں مرے اشعار میں جولانیاں اس کی

لاحول ولاقوۃ! کہیں یہ سب کچھ مجاز کے شاعرانہ دماغ کا واہمہ تو نہیں اور یہ جیتی جاگتی عورت جسے میں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہیں اس کی یہ تمنا تو نہیں جسے وجود میں لانے کی آرزو میں یہ ساری جستجو ہے۔ جس کے بغیر خود اس کا وجود ادھورا اور حیران ہے۔ جس کے انتظار میں وہ اس کا وطن غلامی کی بیڑیاں پہنے گھل رہے ہیں۔ جسے وہ چیخ چیخ کر پکار رہا ہے کہ۔

آ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مگر جی نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے تخیل سے کہہ رہا ہے۔ "نوجوان خاتون" ہیولیٰ نہیں، عورت ہے۔ جو شمعِ حرم یا گھر کی رونق ہی نہیں بلکہ ایک ساتھی ہے جو زندگی کی دوڑ میں کندھوں پر سوار نہیں بلکہ نصف بوجھ کاندھوں پر لئے قدم بہ قدم ساتھ ہے جس کا مقصد زندگی ...... "حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا" نہیں ہے

عام یقین ہے کہ اگر عورت گھر سے نکل کر کام کاج شروع کر دے تو اس کی نسائیت اور حسن مارا جاتا ہے۔ وہ بالکل کاروباری اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ نسوانیت اور لطافت باقی نہیں رہتی۔ مجاز کی رائے میں حسین شے خواہ باہر رکھو خواہ اندر حسین ہی رہے گی۔ بات یہ ہے کہ مجاز نے ایسی مثال بھی دیکھی ہے جہاں عورتیں تعلیمیافتہ بھی ہیں، دُنیا کے کاموں میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور نسائیت سے بھی محروم نہیں ہوئیں اور واقعہ یہ ہے کہ شروع شروع میں جو تعلیم کا اثر ہوا تھا وہ بہت کچھ اس مغالطہ میں ڈالنے والا تھا۔ جب عورتوں کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور رنڈی کا پیشہ اختیار کرنا ایک ہی درجہ کا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں جو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں وہ اپنے آپ کو بالکل پاکباز اور مقدس ظاہر کرنے کے لئے بالکل ننوں کی سی زندگی گذارتی تھیں۔ لیکن اب جبکہ تعلیم نسواں کا مسئلہ حل ہی ہو چکا اور لڑکیاں آزادی سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ بالکل غیر دلچسپ اور مُردہ دل نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کی نسوانیت

وغیرہ غائب ہوتی ہے۔ وہ مختلف شعبوں میں کام کرتی ہیں اور لوازماتِ زینت سے بھی غافل نہیں رہتیں۔ عشق و عاشقی کو بھی گناہ نہیں سمجھتیں۔ باوجود کہنہ خیال لوگوں کی چیخ پکار کے مجاز کے تخیل کی عورت نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور اس قدم کو بڑھائے چل رہی ہے اور مجاز کی التجا کہ

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا!

خالی نہیں گئی۔ عورت کو بھی احساس ہو رہا ہے کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

پر مجھے تو تعجب ہے کہ جب مجاز نے پکارا کہ

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں!

تو کسی نے لبیک تو کہا، کسی نے اس کے بلاوے نہ سنے۔ ابھی کون سنتا ہے ان بے جھنکار نیوتوں کو۔ کہنے والے کہتے ہیں ہندوستان میں لڑکیوں کی افراط ہے۔ ہوگی، شاید صرف شادی کے بازار میں جہاں گرانی کے مارے ایسے ویسے کا گزر نہیں۔ مال پڑے گھنا کرتے ہیں۔ ادھر خالی جیبوں والے منہ تکتے ہیں یا پھر بلیک مارکیٹ میں اڑن کھٹولوں پر ٹکٹ لو یا پھر آسمان کی سیر کر آؤ۔

اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں

ویسے میں نے خود صنفِ نازک کو رونا روتے سنا ہے کہ مرد انھیں آزادی نہیں دیتے۔ اللہ جانے وہ آزادی کب ملے گی اور کون لاکر انھیں دے گا اور جب تک یوں ہی رونے روئے جائیں گے اور شاعر چیختے چیختے تھک جائیں گے۔ اس سپاہی کی طرح جس کا ایک ہاتھ آزاد ہو اور دوسرا پیٹھ کے پیچھے مروڑ کر باندھ دیا گیا ہو۔ اور پیٹھ کے پیچھے مروڑا ہوا زخمی ہاتھ اسی طرح لاچاری سے کراہتا رہے گا۔ کاش یہ ہاتھ اپنی انگلیوں کو ہلا کر دو چار گرہیں کھول دیتا تو پھر بہت سی گرہیں آپ سے آپ سرکتی چلی جاتیں۔

(نئے ادبی معیار)

دھرتی کا گیت

مجاز کی پختگی اور تخلیقی کوشش کا ایک روپ اس کے گیت ہیں۔ وہ یقینی طور پر مجاز نے ایک گیت کار کی حیثیت سے شہرت کی انتہائی بلندیاں حاصل کی ہیں۔ مجاز کے گیتوں میں ایسا جادو اور خوبصورتی۔ ایسی عظمت الفاظ کا لطیف ترنم اور مسحور کن احساس ہے کہ پڑھنے والا سحر حسن اور مسرت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور اس کی روح و ذہن پر ایک مرصع گو نغمہ اور موسیقی کی طرح ایک رس تاثر چھوڑ جاتا ہے۔

غمگین کیفیت کے بیان کرنے میں بھی جب مجاز ہجر کے صدموں کے گیت الاپتا ہے اور محبوبہ کی عدم توجہی کی شکایت کرتا ہے تو بھی وہ زندگی کی مسرت کے سرگرم جذبات کی لہروں سے الگ نہیں ہوتا۔

ایک مارکس وادی اور ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی مجاز انتہائی کٹر قریباً قریباً حساس واقع ہوا تھا۔ وہ زندگی کی صعوبتوں اور جدوجہد کے تقاضوں میں اپنے آپ کو نہ ڈھال سکا۔ اگرچہ اس کی نظم کے ایک بند سے صاف عیاں ہے کہ وہ یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ انسانی نجات کے عظیم مقصد کو جدوجہد کے ذریعہ حاصل کرنے پر ہی روحانی مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

(سجاد ظہیر)

اطہر پرویز ایم اے

اسرار الحق مجاز

چند یادیں

بکھرو برگ و لالہ و سرو و سمن کو کیا ہوا — سارا چمن اداس ہے ہائے چمن کو کیا ہوا
جس کی نوائے دلستاں زمزمہ ساز گوش تھی — کوئی بتاؤ اس بت غنچہ دہن کو کیا ہوا

پچھلے دنوں مجاز دلی آئے تھے۔ غالباً ریڈیو کے مشاعرے میں۔ آزاد ہند ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رانچی سے واپسی پر میری ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن اس ملاقات میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، جیسے کوئی انہونی سی بات ہے۔ یا تو مجاز تو چپ کر لیتے تھے، دور سے دیکھتے ہی باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ؎

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

آواز میں آہستگی، چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی، پھر ذرا آہستہ سے پوچھا "کہو جامعہ میں سب اچھے ہیں، صدیقہ اور بچوں کا کیا حال ہے؟"

میرا دل دہل گیا، ان اچھوں کے سے سوال میں مغائرت کی بو آ رہی تھی، جسے شاید وہ لوگ زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں جنہوں نے مجاز کو قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے کہا "میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ آپ اس طرح خیریت دریافت کریں گے۔ بات کیا ہے؟"

مجاز کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اور پھر جیسے سوتے سے جاگ گئے ہوں، مسکرا کر بولے "بھائی تمہارے سہیل نے وہی جو سہیل کم اور عظیم آبادی زیادہ ہے، پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہاں سے رہائی نصیب ہوئی۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ خواہش تو غالب کی تھی کہ ؏ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا! لیکن یہ غالب کی دعا میرے لئے کیوں پوری ہونے والی ہے۔ لیکن پہلو اثر کو دعا کے ساتھ روایتی دشمنی تھی ہی میری مراد بر آئی۔ ساتھ خیریت کے گھر واپس آگیا۔ غالب کی دعا بھی پوری نہ ہوئی اگر کہیں اقبال کی مانگی ہوئی تو میرا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ اب بھی دیکھو۔ آپ تو یہ کہہ کے رخصت ہو گئے کہ ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

اور اب ہم آگئے تو میر کا سا حال ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

مجاز یہ ساری باتیں ایک سانس کہہ گئے اور پھر خلاف توقع خاموش۔ اس وقت مجاز بظاہر پہلے سے بہتر تھے، لیکن موت نے گویا اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ بالآخر ۵ دسمبر کی صبح ہم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ "نوجوانوں کا محبوب، ادیبوں کا منظورِ نظر شاعر ہمیشہ کے لئے رخصت

ہو گیا۔ اب وہ کبھی شعر نہیں کہے گا۔ اس کے ساتھ اس کی ساری ان کہی غزلیں اور نظمیں زندہ درگور ہو گئیں۔ اس کی بذلہ سنجی دفن ہو گئی۔ اب ادیبوں کی محفلوں میں ایسی نفیس اور چٹیلی باتیں کون کرے گا، جن کو سن کر ہم مہینوں لطف اندوز ہوں۔ مجاز کے ساتھ یہ ساری باتیں بھی گئیں۔ صدیقہ نے خبر سن کر کہا: "ہڈیوں کا ایک ڈھانچا تھا اللہ میاں سے وہ بھی نہ دیکھا گیا۔" تاباں نے آبدیدہ لہجے میں کہا: "اتنے خوبصورت شعر کہتا تھا کیسے مر گیا؟"

ہم سب کے دماغ عجیب و غریب سمتوں میں بہہ رہے تھے۔ یوں تو برسوں سے موت مجاز کے لئے اپنے دانت تیز کر رہی تھی، لیکن اسے آج موقع ملا۔ مجاز کی روح قبض کرتے وقت موت کی روح بھی لرز گئی ہوگی اس لئے کہ مجاز کے یہاں تو ہر لمحہ ؎

کار فرما ہے کوئی تازہ جنونِ تعمیر — دل مضطر ابھی آماجگہ یاس نہیں

اور اسی لئے اسے اپنے شعروں کے لئے خونِ جگر نذر کرنا پڑا اور یہ اپنی سوزِ دروں جب تک زندہ رہا ہنستا رہا، گاتا رہا اور اسی سوزِ دروں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی محبوبہ سے کہتا رہا ؎

کیا سنو گی مری مجروح جوانی کی پکار
میری فریاد جگر دوز مرا نالۂ زار
شدتِ کرب میں ڈوبی ہوئی میری گفتار
میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

وہ گدازِ دلِ مرحوم کہاں سے لاؤں
اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

ہائے وہ جذبۂ معصوم کہاں مل سکے گا۔ مجاز کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوئی۔ یوں تو زمانے نے اپنے فنکاروں کے ساتھ کون سا انصاف کیا تھا جو مجاز کے ساتھ کرتا۔ یہی سلوک میر کے ساتھ کیا، یہی غالب کے ساتھ کیا۔ لیکن اس باشعور زمانے میں مجاز کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے مجاز ہی اس کو معاف کر سکتا ہے ؎

مری بربادیوں کا ہم نشینو — تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

مجاز اس کی سعیِ جنوں خیز پر ہمیشہ خنداں رہا۔ مگر ہمیں اس وقت اس جنوں خیزی کی کامرانی سی نظر آ رہی ہے۔ لیکن اگر اس وقتی کامرانی کو مان لیں تو کیا یہ مجاز کے ساتھ انصاف ہوگا؟ وہ جو اپنے وجود ہی کو ایک افسانہ سمجھتا تھا، افسوس کہ وہ اپنی زندگی میں اسے افسانہ نہ بنا سکا۔ اس کے جیتے جی "فیضِ مے و ساقی و میخانہ" عام نہ ہو سکا۔ جس طرح زندگی بھر چاک گریباں رہا، اسی طرح رخصت ہوا۔ موت بڑی ظالم ہے، لیکن زندگی ہی اس کے لئے کون رحم دل ثابت ہوئی ؎

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

آج ادیبوں، شاعروں، دوستوں اور اس کے اشعار پر سر دھننے والے سیکڑوں، ہزاروں آدمیوں کا یہ حال ہے کہ وہ سب چشمِ گریاں دلِ پُرخوں اور جگرِ زخم آلودہ ایک باغ لگائے بیٹھے ہیں اور اس باغ میں مجاز کی چہکار، اس کا ترنم، اس کی بذلہ سنجی سب کی سب خاموش ہیں۔ یہ اب کبھی نہ بولیں گی۔

مجاز کی موت نے آج ادیبوں اور شاعروں کو جھنجھوڑ دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اردو کا ہر فنکار اپنے آپ سے ایک سوال پوچھ رہا ہے صرف ایک سوال۔ میں اس کو دہرا کر زخموں سے کھیلنا نہیں چاہتا۔ مجاز پہلے بھی مر سکتا تھا جب وہ بہت بیمار تھا۔

بستر پر اطمینان سے مر سکتا تھا، موت پر ایک آخری فقرہ کستے ہوئے، دوستوں کو سناتے ہوئے، لیکن وہ اس طرح کیوں مرا۔ اسپتال کے جنرل وارڈ میں، جہاں علاج تو درکنار کوئی نرس بھی چارہ گر نہ تھی۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے مجاز کی موت تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ کیا ایک فن کار کی موت اسی طرح ہوتی ہے؟ عصمت چغتائی نے کہا ہے: "مجھے مجاز کی بعض عادتوں پر جب غصہ آتا تھا تو میں چڑھ کر کہتی تھی "مجاز! اس سے اچھا ہوتا کہ تم مر جاتے" اور آج اس وقت جبکہ مجاز مر گیا ہے، مجھے یوں لگتا ہے جیسے مجاز نے میرے منہ پر طمانچہ مار دیا ہو اور کہہ رہا ہو: "لو میں مر گیا، تم مرنے کو اتنی بڑی بات سمجھتی تھیں؟"

یہ موت تنہا مجاز کی موت نہیں، میر اور غالب کی ایک اور موت ہے۔ آج ہم ایک غالب کو حیات ثانیہ دے رہے ہیں اور ایک غالب کو مار رہے ہیں۔ یہ ہم سب کے لئے لمحۂ فکر ہے۔

میں مجاز کو علی گڑھ سے جانتا ہوں جب میں طالب علم تھا۔ یہ اب سے تیرہ چودہ سال پہلے کی بات ہے۔ ہم لوگ مجاز کا علی گڑھ کے آثار قدیمہ کی طرح سے احترام کرتے تھے جہاں وہ شعر کہنے کی وجہ سے شاعر نہیں بلکہ بزعم خویش حقہ پینے کی وجہ سے محق تھے۔ وہاں ہم نے اسے جہاں کہیں بھی دیکھا اچھوتوں میں سے ایک پایا۔ وہ آفتاب ہوسٹل ہو یا ممتاز ہاؤس، مارلین کورٹ ہو یا عثمانیہ، مجاز ان محفلوں میں اس طرح گونجتا تھا جیسے وہاں سدا سے رہتا آیا تھا۔ علی گڑھ والوں نے مجاز سے کبھی اجنبیت محسوس نہ کی اور سچ پوچھئے تو ہمارے لئے مجاز کی حیثیت وہی تھی جو اسٹریچی ہال کی پرشکوہ عمارت کی، لٹن لائبریری کے علمی خزانوں کی، یا مسجد کے گنبد و مینار کی۔ مجاز کو اپنے علیگ ہونے پر فخر ہو یا نہ ہو لیکن علی گڑھ والے مجاز پر ناز کرتے ہیں کہ ایک ایسا شاعر اور انسان اس سرزمین پر چلتا پھرتا تھا۔ مجاز کی زندگی میں علی گڑھ ایک واقعہ بھی ہے، ایک حادثہ اور ایک سانحہ بھی۔ بقول عصمت چغتائی ایک ایسا دور بھی رہا ہے "جب مجاز کے نام پر گرلز کالجوں میں لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں کہ مجاز کس کے حصے میں پڑتا ہے اور اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور جب کنواریاں اپنے آئندہ بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں" اور وہ اپنے قہقہوں، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور اڑتے ہوئے دوپٹوں کی لہروں میں مجاز کے شعر گنگناتی تھیں، اور سمجھتی تھیں کہ مجاز ان کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن عورت، مجاز کی زندگی میں ایک محرومی کا درجہ رکھتی تھی۔

عصمت نے لکھنؤ میں مجاز کی موت کے تیسرے دن کہا تھا "مجاز کو میں نے جب دیکھا تو وہ نوجوان لڑکیوں میں ایسا مقبول تھا کہ بہت سی لڑکیاں اس کی رفیقۂ حیات بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں مگر یہ کیا ہوا کہ مجاز ناشاد و نامراد دنیا سے چل بسا، یہ کیوں ہے کہ لڑکیاں مجاز سے عشق کریں مگر جب شادی کا وقت آئے تو وہ تجوریوں سے شادی کریں؟ سماج کے یہ حالات ایسے تھے جن سے مجاز لڑا، ایک لڑتا ہے اور سیکڑوں کی ہمت بڑھتی ہے۔"

اسی سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو مجاز کی نفسیات کا آئینہ دار ہے اور عصمت کے ان جملوں کی وضاحت کرتا ہے۔ کانپور کی ایک سڑک پر مونگ پھلی کھاتے ہوئے لاابالیانہ انداز سے چلتے ہوئے مجاز کی نظر ایک تانگے پر پڑنے کو تھی کہ ایک نقرئی آواز فضا میں گونجی، ہم سب چونک پڑے۔ "بجیا دیکھ مجاز جا رہا ہے۔ یہی ہے وہ مجاز"

اور پھر جب مجاز نے سر اٹھایا تو تانگہ بہت دور جا چکا تھا اور مجاز کو ایک ذہنی خلفشار میں چھوڑ گیا۔ وہ چڑ کر بولا۔

"یہ لڑکیاں ہمیشہ ایسے ہی نشتر چبھوتی ہیں، یوں ہی زندگی میں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ اور ہم ان کے لئے محض کھلونے کی حیثیت رکھتے ہیں، بجیا کو دکھانے کے۔"

حالانکہ مجاز کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان میں سے ہر لڑکی اپنے آپ کو اعتراف کی ہیروئن سمجھتی تھی، جیسے مجاز نے ان کے لئے ہی تو کہا تھا:

میں نے مانا کہ تم اک پیکر رعنائی ہو
چمن دہر میں روح چمن آرائی ہو
طلعت مہر ہو فردوس کی برنائی ہو
بنت مہتاب ہو گردوں سے اتر آئی ہو
اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

مجاز نے اردو شاعری کو ایک انقلابی لے دی۔ مجاز نے ان نوجوان خواتین سے آنچل کے پرچم بنانے کا مطالبہ کیا۔ مجاز نے انھیں رسوم و قیود کو توڑ کر باہر آنے کی دعوت دی اور وہ نہ صرف ان نظموں پر اپنے سر دھن رہی تھیں بلکہ ان میں اپنے نعرے بھی تلاش کر رہی تھیں ؎

ترے زیر نگیں گھر ہو محل ہو، قصر ہو کچھ ہو　　میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا
اگر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل　　بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

مجاز برسوں اردو شاعری میں اس نئی نسل کی نوجوان امنگوں کی ترجمانی کرتا رہا۔ غالباً نواب جعفر علی خاں اثر نے ہی تو کہا تھا کہ "اردو میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا لیکن بھیڑیوں کا ایک گروہ اسے اٹھا لے گیا۔"

بھیڑیوں کے گلّے کی تلمیح تو وضاحت طلب ہے لیکن مجاز کیٹس کے قبیلے سے ضرور تعلق رکھتا تھا۔

مجاز کلکتہ کی کلچرل کانفرنس میں گئے۔ غالباً یہ بات اپریل ۵۰ء کی ہے۔ ہمارے ساتھی عبید، انور اور شاہان جب کلکتہ سے واپس آئے تو ہم لوگوں نے مجاز کی خیریت پوچھی۔ کہنے لگے "کلچرل کانفرنس کی ریلی میں مجاز دہلی گروپ کے آگے آگے پرچم لئے جا رہا تھا۔ پسینے میں شرابور، بے تکان گاتا ہوا جلوس کے ساتھ میلوں چلتا رہا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ مجاز کے جنوں کا عالم تھا۔ اور مجھے خیال آیا کہ مجاز کے جنوں میں بھی بڑی حد تک خود آگہی ہے۔ وہ اس قطعہ کو پڑھتے ہوئے اس میں ایک نئی روح پھونک رہا تھا۔ اگر میر نے یہ قطعہ نہ بھی کہا ہوتا تو کلکتہ کے اس تہذیبی جلوس پر مجاز خود ہی کہہ لیا ہوتا۔ مجاز نے ان اشعار کو اپنا لیا تھا۔ اچھے شعر کسی کی ملکیت نہیں ہوتے۔

مجاز کے اندر ایک شعلۂ جوالا تھا جو برابر فروزاں رہا۔ مجاز اپنی زندگی اور سرمستی میں اسے بجھانے کی سعی بے پایاں میں لگا رہا۔ مگر وہ شعلہ بھی مجاز کے اندر تھا۔ اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے کیسے تیار ہوتا ؎

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز کو دلی سے بے پایاں محبت تھی۔ ایک شام میں ٹیکسی سے ایڈورڈ پارک کے سامنے اترا اور ابھی ٹیکسی والے کو کرایہ ہی دے رہا تھا کہ اچانک کسی نے میری گردن پکڑ لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجاز کھڑے تھے، ہاتھ میں گلاس لئے ہوئے بڑے فاتحانہ انداز میں بولے "ہلو پرودیر! یہ شراب نہیں ہے، صرف گنّے کا رس ہے، تم بھی پیو، میں تو وسکی کے نشے کو دوآتشہ کر رہا ہوں" یہ کہہ کر ایک گھونٹ میں اسے پی گئے اور خوانچے والے کو گلاس واپس کرتے ہوئے بولے "تم جانتے ہو میں کون ہوں، میں مجاز ہوں، شاعر آوارہ، لو یہ ایک روپیہ لے جاؤ، تم کو انعام دیا۔ تم بھی فخر کرو گے کہ تمہارے گلاس میں کسی شاعر نے رس پیا تھا۔ جاؤ لے جاؤ۔ یہ دل ہے، ہندوستان کا دل، غالب کا دل، امیر خسرو کا دل، میرا اور تمہارا دل" اور نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"پرودیر! جانتے ہو یہ ایڈورڈ پارک کی دوسری طرف جو سنیما دکھائی دے رہا ہے، اس کا نام تھا نشاط، اسی نشاط کی آڑ سے مہتاب نکلا تھا اور یہ آج سے برسوں پہلے کی بات ہے۔ جب مجاز مجاز تھا، وہ یہ دہلی دہلی تھی۔ اس وقت میں نے اسی سڑک پر آوارہ گردی کی تھی۔ شراب کے لطیف نشے میں ——— یوں تو وہ کلاب بھی ہے، چاند اب بھی نکل سکتا ہے۔ مگر وہ بات کہاں۔ میں نے اس دریا گنج کی سڑک پر کتنی راتیں جاوداں کر لیں۔ اور تم نے اس رات کا ذکر پڑھا ہوگا۔ اور پھر مجاز نہ جانے کتنی لطیف یادوں میں کھو گیا۔ ان نظروں میں گم ہو گیا۔ پھر اس کی نظر ایڈورڈ پارک کے قد آدم مجسمے پر پڑی۔ ایڈورڈ کا یہ مجسمہ جو ایک گھوڑے پر سوار تھا مجاز نے اس کی

عزت بڑی حقارت سے دیکھا اور بولا "برخوردار چڑھ تو گئے اب اُترا نہیں جاتا!" اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کے سامنے برطانوی سامراج بے بس ہو، اور مجاز نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مجاز کو دلی آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے، بقول غالب موت کا بھی ایک دن معین ہے مگر مجاز کے آنے کا کوئی دن معین نہ تھا کہ کس وقت کہاں پہنچ جائیں۔ انہی دنوں ایک بار جامعہ آئے، رات کے گیارہ بجے، سردیوں کا زمانہ تھا ہم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک طالب علم نے مژدہ سُنایا کہ مجاز تشریف لا رہے ہیں، دروازہ کھولا تو مجاز مستانہ انداز میں اندر داخل ہوئے، چہرے پر وہی کیفیت تھی جو اب روزمرہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ تین بجے تک یونہی بیٹھے باتیں کرتے رہے، شعر سُناتے رہے اور ساتھ ہی یہ فرمائش کی کہ چلو خلیق، سلامت، تاباں اور رشید نعمانی کے یہاں چلیں۔ آج رات بھر باتیں کریں گے اور یہ رات یوں ہی شعر خوانی میں گزار دیں گے۔ میں اور صدیقہ دونوں ان کی اس فرمائش کو ٹالتے رہے کہ اچانک مجاز کو اپنی والدہ یاد آ گئیں۔ جن کو ان کی حالت زار کا علم ہو چکا تھا اور وہ ہر ایک کو ان کی خیریت کے لئے خط لکھ رہی تھیں۔ ادھر چند روز پیشتر صفیہ آپا بھی ان کی تلاش میں دلی آئی تھیں مگر کئی دن کی جستجو کے باوجود بھی مجاز سے نہ مل سکیں اور چلی گئیں۔ ہاں تو اس وقت انھیں اپنی والدہ یاد آ گئیں۔ اُن کا خیال آتے ہی مجاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو شاذ و نادر ہی اولاد کی آنکھوں میں اس طرح آتے ہیں اور پھر انھیں ان کی شفقت و محبت یاد آ گئی۔ انھیں لاہور ریڈیو کا وہ مشاعرہ یاد آ گیا جس کی صدارت فیض کر رہے تھے۔ مجاز اس میں شرکت کے لئے لاہور گئے تھے۔ ان کی والدہ ریڈیو سُن رہی تھیں کہ کم از کم اُن کے لاہور پہنچنے کی اطلاع ہی مل جائے۔ چنانچہ جب فیض نے کہا "اب حضرت مجاز اپنی نظم پڑھیں گے۔" تو مجاز کی والدہ نے ریڈیو سے یہ اعلان سُنتے ہی کہا "اچھا، وہاں جا کر حضرت ہو گیا ہے"

مجاز کا تعلق سیاسیات سے براہِ راست نہیں رہا، یہ اور بات ہے کہ بنّے بھائی سے ان کے قریبی تعلقات تھے یا سردار و مخدوم کو وہ اپنا دست و بازو سمجھتے تھے، یا انصار ہروانی ان کے بھائی تھے۔ ہاں ابتدائی دور میں پولیس اُن کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود مجاز کے یہاں ترقی پسند تحریکات سے وابستگی میں صرف شدت ہی نہیں بلکہ انتہا درجے کا خلوص بھی رہا ہے جس نے کسی زمانے میں مجاز کا ساتھ نہیں چھوڑا ؎

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بہ پیمانِ حمیت جان کی بازی لگاتا ہوں

یہ خلوص گورنمنٹ ہاؤس سے لے کر کمیونسٹ پارٹی کے دفتر تک ان کے ساتھ وابستہ رہا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی گورنری کے دوران میں اپنی کوٹھی پر ایک نشست کا انتظام کیا تھا جس میں تمام وزرا شریک تھے۔ چنانچہ جب مجاز کا نام آیا تو وہ اس تخت پر جس پر سفید چادر بچھی تھی بڑی شان سے آئے اور اسی عالم کیف و مستی میں بیٹھ گئے اور ذرا سی دیر میں انھوں نے پڑھنا شروع کر دیا ؎

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

بادل بجلی رین اندھیاری — دُکھ کی ماری پرجا ساری
بوڑھے بچے سب دُکھیا ہیں — دُکھیا نر ہیں دُکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے — سب بنئے ہیں سب بیوپاری
کلجگ میں جگ کے رکھوالے — چاندی والے سونے والے
کتنی بھنگے بھن بھن کرتے — ڈھونڈھے ہیں جگ کے رکھوالے

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

مجازؔ نے یہ نظم اسی جوش و خروش کے ساتھ پڑھ ڈالی۔ گویا وہ ارباب حکومت کو چیلنج دے رہے تھے۔ ساری محفل پر ایک خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا، وزرا کے تیور بدل گئے تھے اور مسز سروجنی نائیڈو کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ لیکن مجازؔ کے چہرے پر شادمانی کی لہر تھی یہ جرأت رندانہ نہیں، یہ نا عاقبت اندیشی نہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو اس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔

مجازؔ نے آخری زمانے میں شعر کہنا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ جب بھی لوگ اُن سے کہتے تھے کہ آپ نے کوئی تازہ چیز نہیں لکھی تو وہ ہنس کر یہی جواب دیتے "ابھی تک جو کہا ہے اس پر ہی کون سا عمل ہوا ہے جو آئندہ اور لکھوں گا" بظاہر یہ ہنسی کا جملہ تھا لیکن اس جملے کے پیچھے بڑا تیکھا پن ہے ؎

خود جھجکتا ہوں کہ دعوائے جنوں کیا کیجے
کچھ گوارا بھی ہے یہ قید در و بام ابھی

میں نے مجازؔ کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ مجازؔ صرف لاابالی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک شریف انسان بھی تھا جس میں خلوص کی شدت اور اصولوں کے لئے تکلیف اٹھانے کا جذبہ بھی موجود تھا۔

میں آخر میں بنّے بھائی کا یہ جملہ دہراؤں گا کہ "مجازؔ انقلاب، تبدیلی اور اُمید کا شاعر تھا، ہمیں اس کی یاد میں اپنے دل کو اتنا مغموم نہ کرنا چاہیئے کہ شاعر کے بنیادی پیغام کو بھول جائیں" ؎

بہ این انعام وفا اُف یہ تقاضائے حیات
زندگی وقفِ غم خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

جاں نثار اختر

میرا دوست میرا مہمان

یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ مجاز اُن دنوں ہارڈنگ لائبریری دہلی میں کام کرتا تھا۔ اور میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں لکچرار تھا۔ کالج میں ہر سال دسمبر کے مہینہ میں سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ لیکن بزم ادب کا فنڈ بہت ہی مختصر ہوا کرتا تھا۔ اس لئے بیرونی شعراء میں سے ایک دو ہی کو مدعو کیا جا سکتا تھا۔ اس سال بزم ادب نے صرف مجاز کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اور مجاز میرے خط کے بعد گوالیار آنے کے لئے مجبور ہو گیا۔

مجاز پہلی بار ہم لوگوں کے گھر آ رہا تھا۔ صفیہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ مجاز کو لینے خود اسٹیشن گئی۔ مجھے دو دن سے بخار آ رہا تھا۔ اس لئے اس نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجاز آ گئے اور گھر کی رونق میں دونا اضافہ ہو گیا۔ اس کے آتے ہی ہمارے گھر لوگوں کا جمگھٹا ہونے لگا۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ شہر کی کتنی ہی ادب نواز خواتین نے بھی اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لئے غیر متوقع طور پر ہمارے یہاں جمع ہو گئیں۔ مجاز کی شاعری میں جو لطیف رومانی عنصر ہے اس نے مجاز کو خواتین کے حلقوں میں ہمیشہ حد سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز بنائے رکھا ہے۔ وہ خود کو اگر "شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں" کہتا تھا تو اس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا۔

اسی شام کالج میں مشاعرہ تھا۔ میں کالج کے مشاعرہ میں بھی نہ جا سکا۔ میرے عزیز دوست اور ہندی کے مشہور کوی شیو منگل سنگھ سمن جو اس وقت کالج میں میرے ساتھی پروفیسروں میں سے تھے مجاز کو اپنے ساتھ کالج لے گئے۔ مشاعرہ ہوا اور بہت کامیاب رہا۔ دوسرے روز کوی سمیلن تھا۔ سمن شام ہی سے مجاز کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ وہاں ایسی محفل جمی کہ تقریباً ساڑھے دس بج گئے۔ جس وقت مجاز اور سمن کالج پہنچے۔ کالج کے لڑکے بطور احتجاج کوی سمیلن کے بائیکاٹ پر اتر آئے۔ سمن نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی لیکن طلباء بے قابو ہو چکے تھے۔ آخر کار مجاز نے اٹھ کر ذاتی طور پر معذرت چاہی۔ اور اس تاخیر کے الزام کو اپنے سر لے لیا۔ اس نے کہا، آپ بیشک مجھے کوسئے کہ جس کی وجہ سے آپ کو یہ تکلیف اٹھانی پڑی، یہ [illegible] آپ کا ہے۔ آپ خود اس کا بائیکاٹ کیسے کر سکتے ہیں؟ مجاز کے اس اخلاقی اقدام نے بجلی کا سا اثر کیا اور ساتھ ہی "آوارہ" "آواز" کے تقاضوں سے ہال گونجنے لگا۔ اور ایک منٹ نہ گزرا تھا کہ مجاز اپنے مترنم مگر ٹوٹتے ہوئے لہجے میں اپنے تڑپتے ہوئے دل کی بات کہہ رہا تھا۔

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جو لوگ مجاز کو اس کی بے روزگاری کے لئے ہدف ملامت بناتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ اس کی بے روزگاری کے پیچھے اس کی ناکام معاشی جدوجہد کی کتنی لمبی داستان چھپی ہوئی ہے۔ اس نے کئی ملازمتیں کیں، لیکن کوئی ملازمت اسے راس نہ آئی۔ اور اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ اس نے کسی جھوٹی مفاہمت کی آنچ کو اپنے ضمیر اور اپنی ترقی پسندی کو چھونا گوارا نہیں کیا۔ تقریباً ڈھائی بجے رات کو کوی سمیلن ختم ہوا۔ کالج کے لڑکوں نے مجاز کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس رات کا ہیرو بس مجاز ہی تھا۔

دوسرے دن ہم لوگ مجاز کو گوالیار کے تاریخی مقامات دکھانے کے لئے لے گئے۔ گوالیار کا قلعہ، رانی جھانسی کا میموریل، تان سین کا مزار، میوزیم وغیرہ تان سین کے مزار پر مجاز، ماجد میاں اور ایوب مرزا دیر تک قوالی سنتے رہے۔ واپسی پر مجاز مجھ سے کہنے لگا "آخر یہ تان سین کا مسلمان ہو جانا بے سبب نہیں۔ آخر خواجہ محمد غوث کے ہو رہنے میں تو وہ نہیں ملتا۔" لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ ایک غیر مستند روایت یہ بھی ہے کہ اس نے کسی مسلمان لڑکی

کے حق میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ تو مجاز خوش ہوگیا۔ اور کہنے لگا۔ بس یہی مستند باقی سب غیر مستند۔ پھر وہ رات بھر گنگناتا رہا۔

عطیہ کی بدولت آج ایک کافر مسلماں ہوگیا

ہم لوگ گھر واپس ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ مجاز نے "آشا" کی فرمائش کی۔ یہ گوالیار کی خاص شراب ہے۔ اپنے ذائقے اور نشے کے اعتبار سے بہت تیز و تند ہوتی ہے۔ دوسرے دن تو مجاز نے اسے "مئے مرد افگن" کا لقب دیدیا تھا۔ غرض کہ باہر کے کمرے میں محفل جمی۔ میرے دو ایک دوست بھی شریک تھے۔ کوئی دس بجے کے قریب سب کے رخصت ہونے کے بعد میں اور مجاز تنہا رہ گئے۔ اس زمانے میں مجاز شراب کے بعد بھی خاموش سا بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن اس رات اس نے نہ جانے کتنی باتیں مجھ سے کر ڈالیں۔ عام طور پر مسلسل گفتگو مجاز کے بس کی بات نہ تھی لیکن آج وہ متواتر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے تک اکیلا ہی بولتا رہا۔ اسے اپنے بہت سے عزیز دوستوں سے شکایت تھی۔ اسے اس "زہرہ جبیں" سے بھی شکوہ تھا جس سے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ ایسا ضرور محسوس کرتا تھا کہ اسے جو محبت جواب میں ملنی چاہیئے تھی اس میں کہیں کمی ضرور رہ گئی ہے۔ مجھ سے بڑے موثر لہجہ میں کہنے لگا "اختر میں چاہتا تھا کہ اپنے مجموعے کے کسی ایڈیشن کو اس کے نام منسوب کردوں لیکن اس نے منظور نہیں کیا۔" میں نے اسے متاثر ہوتے دیکھ کر بات کا رخ موڑنا چاہا۔ میں نے کہا۔ لیکن یہ فیض کے دیباچے کا نام جو تم نے آہنگ کا انتساب کیا ہے۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ تم فیض ہی کے نام منسوب کردیتے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ انتساب اس کا کیا ہوا نہیں۔ خود مکتبہ والوں کی ذہنی اپچ ہے۔ پھر وہ فیض کے بارے میں بہت سی پیاری باتیں کرتا رہا۔ اسے اپنے ہمعصروں میں فیض اور جذبی سے بے حد پیار تھا۔ جذبی سے اپنی کئی لڑائیاں بھی بیان کرتا رہا۔ پھر وہ خود میرے اور صفیہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اپنے گھر میں اسے صفیہ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ صفیہ کو وہ بہت چاہتا تھا۔ اور ساتھ ہی ذہنی طور پر مرعوب بھی تھا۔ کرشن چندر نے زیر لب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "اپنی سماجی سوجھ بوجھ میں اپنے انداز فکر میں اپنے محسوسات کی تنظیم و ترتیب میں صفیہ مجاز سے بہت آگے تھی" تو مجاز کو اس بات کا احساس ہی نہیں اعتراف بھی تھا۔ صفیہ کے مرنے پر جو خط اس نے سہیل عظیم آبادی کے نام لکھا ہے۔ اور جو اتفاق سے پوسٹ کرنا بھول گیا تھا وہ اس کے کاغذات میں موجود ہے۔ اس میں مجاز نے صفیہ کی موت پر لکھا ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا ذہن ہمیشہ کے لئے سو گیا ہو۔ حد یہ تھی کہ مجاز نے کبھی صفیہ کے سامنے پی کر آنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن اس رات وہ صفیہ کے متعلق بے تحاشا باتیں کرتے کرتے یہ بھول گیا کہ وہ بہت زیادہ نشے کے عالم میں ہے اور اس نے یکبارگی مجھ سے کہا۔ اختر صفیہ کو بلالاؤ۔ میں نے اندر جاکر صفیہ سے کہا۔ مجاز تمہیں بلاتے ہیں۔ لیکن صفیہ تیار نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔ "اختر تم یقین کرو۔ میں نے کبھی اسرار بھائی کو اس عالم میں نہیں دیکھا ہے۔ اور نہ میں انہیں اس عالم میں دیکھنے کی تاب رکھتی ہوں۔ یہ میری جذباتی کمزوری ہے۔ پھر اگر میں اس وقت بالفرض چلی بھی جاؤں تو اسرار بھائی پر صبح اپنی اس جراءت کا بہت برا اثر ہوگا۔ اور وہ کل تو چلے ہی جائیں گے۔ لیکن شاید پھر کبھی میرے گھر آنے کی اُن میں ہمت نہ رہے۔" میں نے صفیہ سے کوئی اصرار نہیں کیا۔ اور باہر آکر مجاز سے صفیہ کی کمزوری بیان کردی۔ صفیہ کے انکار پر مجاز نے بے قابو ہوکر رونا شروع کردیا۔ میرے گلے میں دونوں ہاتھ ڈالے وہ بڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ ادھر صفیہ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا۔ آخر اسی عالم میں مجاز بغیر کھانا کھائے بستر پر پڑ کے سو گیا۔ اور صفیہ اس کے سرہانے اس کے سر پر ہاتھ رکھے رات بھر بیٹھی روتی رہی۔ صبح جب مجاز کی آنکھ کھلی تو صفیہ نے مجاز کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور دیر تک اس کے سینے میں منھ چھپائے روتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم مجاز نے صفیہ سے یا صفیہ نے مجاز سے کچھ کہا یا نہیں۔ کیونکہ میں اس کمرے سے باہر چلا آیا تھا اگر نہ چلا آتا تو خود میرے رو پڑنے میں کسر نہ رہ گئی تھی۔

مجاز کا ارادہ اس دن روانگی کا تھا لیکن صفیہ نے اسے ہرگز جانے کی اجازت نہ دی۔ دن بھر مجاز گھر ہی پر رہے۔ ماجد میاں نے مجاز کے پیچھے پڑ کے اسے بیت بازی کے لئے راضی کرلیا۔ ماجد میاں، ایوب مرزا اور جاوید مجاز ایک طرف ہوگئے اور میں تنہا ایک طرف۔ بیت بازی کے لئے موضوع کا انتخاب کیا گیا "آنکھ"۔ اور یہ قید اٹھادی گئی ہے فلاں حرف سے مصرع شروع ہو۔ البتہ شعر کے

معیاری ہونے کی شرط تھی، اور اس کے لئے صفیہ جج مقرر کر دی گئی۔ مجاز کو اچھی طرح پر شعر یاد تھے۔ اصل بیت بازی ماجد میاں سے ہو رہی تھی۔ مجاز ان کا سہارا
بنے جا رہے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے بے تحاشا شعر یاد ہیں۔ غالباً ان ہی شعروں نے شاعر ہونے کے لئے ایک لاکھ شعر یاد ہونے کی قید بھی لگائی ہے، اگر وہ کچھ
زیادہ کی قید بھی لگاتا تو کم سے کم مجھے فکر نہ ہوتی۔ صفیہ کہا کرتی تھی کہ اختر تمہارا حافظہ اس معاملے میں کباڑ خانہ ہے، اچھے برے ٹیڑھے سیدھے
ہر طرح کے شعر تمہیں یاد کیسے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال تین چار گھنٹے کے بعد نوبت یہاں پہنچی کہ ماجد میاں کا خزانہ ختم ہونے لگا۔ اور مجاز نے شعر
گھڑنا شروع کر دیئے۔ ظاہر ہے جلدی میں گھڑا ہوا شعر کیسے معیاری ہو۔ جہاں مجاز نے شعر دیا اور صفیہ نے "غلط" کہہ دیا۔ نتیجے میں ماجد میاں اور
مجاز کو مات ہوئی۔ اور صفیہ نے دونوں سے لڑ جھگڑ کر مٹھائی کے لئے پیسے وصول کر لئے۔

اس رات شراب کو محفل سے نکال دیا گیا۔ اور "انگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں" والی محفل تقریباً صبح تک ہی جمی رہی۔ نہ
جانے کہاں کہاں کے دلچسپ قصے اور کتنے لطیفے مجاز نے سنا ڈالے۔ ان میں ایک قصہ یہ بھی تھا کہ قلعہ ہاتھرس میں واٹر ٹینک کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ
تھا، خاصی تعداد میں شاعر آئے تھے۔ دوسری صبح جلسے کی تیاری تھی کہ تحصیلدار صاحب نے سب شاعروں کو بلوا بھیجا۔ خود ایک کرسی پر تشریف رکھے بیٹھے تھے
برابر میں ایک لوہے کی تپائی پر منشی جی بیٹھے تھے۔ جب شاعر جمع ہو گئے تو تحصیلدار صاحب نے نام پکارنے کے لئے کہا۔ منشی جی نے شاعر کا نام
پکارا، وہ آگے بڑھا، تحصیلدار صاحب نے سوال کیا، "آپ سے کیا رقم طے ہوئی تھی؟" وہ کچھ جھجکا، پھر انہوں نے ذرا ڈانٹ کر کہا: "بتایئے کیا طے
ہوا تھا؟" مجبوراً اسے بتانا پڑا، "دو سو روپیہ۔" تحصیلدار صاحب نے منشی جی کو حکم دیا: "آپ کو صرف ایک سو ساٹھ روپیہ دیجئے۔" شاعر کچھ جز
بز ہوا تو ارشاد ہوا "گڑبڑ دیکھئے، تشریف لے جایئے۔" غرض سب ہی کا یہ حشر ہوتا رہا۔ شعراء نے جائے قیام پر پہنچ کر بہت شور و غل مچایا۔ ابھی
یہ شور و غل جاری ہی تھا کہ تحصیلدار صاحب کے ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی کہ ہاتھرس کی بس تیار ہے سب شعراء صاحبان اسی بس سے
چلے جائیں۔ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔

آج کا دن مجاز کی روانگی کا تھا، مجاز کو کالج سے جو رقم ملنے والی تھی، صفیہ نے اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی دن تاکید کر دی تھی کہ اسے مجاز کے
پیسے انہیں بالکل نہیں دینا، تم مجھے لا کر دے دینا۔ چنانچہ میں نے اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ مجاز نے کالج کے پیسوں کا کوئی تقاضا ابھی تک مجھ سے
نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اسے جانا تھا۔ اور اس کے پاس غالباً کرایہ بھی نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ دبی زبان سے اس نے مجھ سے کہا: "اختر کالج سے اگر پیسے
کا کرایہ مل جاتا تو اچھا تھا۔" میں نے کہا "تمہارے پیسے صفیہ کے پاس رکھے ہیں" وہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن چلتے وقت جب صفیہ نے اسے چالیس روپے لا کر
دیئے کہ یہ آپ کے ٹکٹ کے پیسے ہیں، باقی کے میں نے آپ کے کپڑے سلوا کے آپ کے بکس میں رکھ دیئے ہیں، تو مجاز پہلے تو بہت جھنجھلایا۔ کہنے
لگا "کپڑوں کی کیا ضرورت تھی، میرے پاس ضرورت سے زیادہ کپڑے موجود ہیں۔" صفیہ نے کہا: "تو مجھے پتہ ہے آپ کے پاس جتنے کپڑے ہیں۔"
آخر میں مجاز کہنے لگا "تم بھی تحصیلدارنی سے کم نہیں ہو۔" اور ہم سب دیر تک رات کے سنے ہوئے قصے کی روشنی میں اس فقرے کا لطف لیتے
رہے۔ میں نے کہا "چلو صبر کرو، زیادہ سے زیادہ اس طرح شاعروں میں تمہارے بھی چالیس روپے کٹے ہوں گے، سمجھو وہ یہاں مل گئے۔" کہنے لگا "وہ ان
پیسوں سے بھی صفیہ نے جوتے وغیرہ خرید دیئے ہوتے تو کیا کر لیتے۔"

آخر وہ لمحہ بھی آ گیا۔ جب مجاز رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، صفیہ دیر تک اس سے لپٹی کھڑی رہی، مجاز نے اس کی مانگ پر پیار کیا۔ اور
اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے جاوید کے لئے کھلونے خریدے اور مجھے دیئے کہ میں اسے دے دوں۔ ویٹنگ روم میں بیٹھے ہم دیر تک باتیں کر
رہے تھے کہ اتنے میں ایوب نے آ کر اطلاع دی کہ مجاز صاحب ٹرین آ رہی ہے، مجاز نے چپکے سے کہا: "میں کیسے روک سکتا ہوں۔" ٹرین آئی
اور مجاز مجھ سے گلے مل کے روانہ ہو گیا۔ واپسی پر گھر میں عجیب سناٹا محسوس ہوا۔ اس شام میں اور صفیہ صرف مجاز ہی کی باتیں کرتے رہے
مجاز جو اس کا جان سے پیارا بھائی تھا اور میرا بچپن کا دوست۔ اور آج جب نہ صفیہ باقی ہے نہ وہ گھر باقی ہے۔ میں سوچتا ہوں
اس دل سے تو وہ میرا دوست وہ میرا بھائی کبھی نہ جا سکے گا۔

شاہراہ
کا
طنز و مزاح نمبر

تاریخ ہے:۔ اُردو کے گزشتہ دس برس کے طنزیہ، مزاحیہ ادب کی
ضرب ہے:۔ دقیانوسی قوتوں کی تمام قلعہ بندیوں پر
قہقہہ ہے:۔ فرسودہ سماجی اور سیاسی نظام کی بوالعجبیوں پر
جامِ جم ہے:۔ زندگی کے حقائق کا، مستقبل کی تابانیوں کا
نگار خانہ ہے:۔ بصیرت افروز، دلپذیر کتنا کارٹونوں کا۔

مرتبہ:۔ فکر تونسوی

ضخامت:۔ ۲۵۰ صفحات۔ قیمت:۔ تین روپے -/3

سالنامہ ۱۹۵۴ء

مرتبہ:۔ ظ انصاری

شاہراہ:۔ ہر سال نہ صرف اپنی روایتوں کو برقرار رکھتا ہے بلکہ انہیں آگے بڑھاتا ہے۔
شاہراہ کا ہر سالنامہ ایک ادبی کانفرنس کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں نامور اور نئے ادیبوں کا ایک عظیم اجتماع ہوتا ہے
۱۹۵۴ کے سالنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر صنفِ ادب سے متعلق گراں بہا تخلیقات ملتی ہیں۔
ضخامت ۲۵۰ صفحے۔ قیمت:۔ ڈھائی روپے 2/8

سالنامہ ۱۹۵۵ء

مرتبہ:۔ فکر تونسوی - محمد یوسف

شاہراہ ہر سال نہ صرف اپنی روایتوں کو برقرار رکھتا ہے بلکہ انہیں آگے بڑھاتا ہے۔
شاہراہ کا سالنامہ ایک ادبی کانفرنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں نامور اور نئے ادیبوں کا ایک عظیم اجتماع ہوتا ہے
۱۹۵۵ کے سالنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر صنفِ ادب سے متعلق گراں بہا تخلیقات ملتی ہیں۔
ضخامت ۱۵۰ صفحے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ 1/8

فیروز اللغات

اُردو کا جامع اور مستند لغت

پانچ سال کی محنت شاقہ کے بعد جمع کئے گئے ساٹھ ہزار الفاظ و محاورات کا مجموعہ، صحت تلفظ، تذکیر و تانیث اور اصطلاحات کی توضیح۔ اس لغت کا امتیازی حسن ہے۔ ضخامت تیرہ سو صفحات۔ قیمت ساڑھے سولہ روپے 16/8

درمیانی سائز — قیمت ساڑھے آٹھ روپے 8/8
جیبی سائز — قیمت ساڑھے چار روپے 4/8
لغات فیروزی:۔ قیمت ساڑھے سات روپے 7/8
فرہنگ عامرہ:۔ قیمت چھ روپے -/6
لغات کشوری:۔ قیمت ساڑھے آٹھ روپے 8/8
کریم اللغات:۔ قیمت دو روپے -/2
انگلش اردو ڈکشنری:۔ قیمت دس روپے -/10
اردو انگلش ڈکشنری:۔ قیمت دس روپے -/10
اردو ہندی لغت:۔ قیمت بیس روپے -/20

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی

سعید اختر نعمانی

مجاز چچا

بات تو قریب قریب پدرم سلطان بود والی ہے مگر کہہ ہی دوں کہ مجاز میرے چچا تھے۔ وہ میرے والد کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے۔ میں مجاز کا صرف بھتیجا ہی نہیں ——— انھوں نے مجھے بھتیجے کے درجے سے بہت بلند کر دیا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھ کو اپنا دوست اور ساتھی تصور کرتے تھے۔ میں نے ان کو اپنے چچا، شاعر، ساتھی اور رند کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ہر حال میں اُن کی شخصیت نمایاں پائی۔ وہ ایک لاابالی رند تھے مگر معصوم صفت۔ بے پایاں محبت کے قابل۔ مجاز چچا سے ایک بار ملنے کے بعد ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا خواہ وہ بچہ ہو یا بوڑھا۔ وہ اپنے چھوٹوں سے نہایت پیار و محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ گھر کے بچوں کے ساتھ کبھی تاش کھیلتے تھے اور کبھی کرکیٹ اُن کو نئے نئے کھیل سکھاتے رہتے تھے۔ آج گھر میں مجاز چچا کی کمی ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ بزرگوں کی عزت مجاز چچا کا مسلک تھا۔ وہ اپنی والدہ کی بے حد عزت کرتے تھے جب کبھی وہ باہر مشاعرہ میں جاتے تھے تو مشاعرہ کی رقم سے کبھی اپنی والدہ کے لئے کشمیری شال اور کرتے لے آتے تھے۔ اور کبھی کپڑا۔ وہ گھر کے بزرگوں کے علاوہ اپنے سے بڑوں کا بھی کافی لحاظ رکھتے تھے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ جگر صاحب کی انتہا عزت کرتے تھے۔ ایک بار رنگا دھر ناتھ فرحت مرحوم کے مکان پر جگر صاحب اور مجاز چچا کا کلام سننے آئے۔ جگر صاحب نے مجاز چچا سے کہا کہ ان حضرت کی خواہش پوری کر دی جائے۔ مجاز چچا نے فوراً جی ہاں کرنے کے بعد اپنی غزل شروع کر دی۔ جگر صاحب کو اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ کہتے کہ آپ پڑھئے یا پہلے میں ہی پڑھوں۔

مجاز چچا کی ہر دلعزیزی کا ثبوت کانپور کے ایک واقعہ سے پیش کروں گا کہ جب ان کا اغوا کر لیا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کانپور کی جانب سے ۱۷ر نومبر سنہ ۱۹۵۱ء کو ہم لوگوں نے ایک مشاعرہ کیا۔ اسی روز کانپور کے چند رجعت پسند شاعروں نے ایک دوسری جگہ مشاعرہ کا اعلان کرکے انجمن کے مشاعرے کو ناکامیاب کرنے کی کوشش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے مرحوم فرحت کے مکان پر جہاں مجاز چچا اسٹیشن سے براہ راست آنے والے تھے ایک آدمی کو متعین کر دیا کہ وہ کسی صورت سے مجاز چچا کو ان کے مشاعرے میں لیجائے۔ وہ آدمی شام کے چار بجے سے ہی فرحت کے مکان پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے قریب آٹھ بجے مجاز چچا کو رکشے پر سوار کرا کے رکشے والے کو انجمن کے مشاعرہ ہال پہنچانے کو کہا۔ میں سائکل پر اپنے گھر ہوتا ہوا مشاعرہ ہال پہنچا، مگر مجاز چچا کو موجود نہ پایا۔ اراکین مشاعرہ ان کے منتظر تھے۔ گیارہ بجے تک میں نے ان کا انتظار گیٹ پر کیا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کہیں ان لوگوں نے شرارت کی ہو۔ میں فوراً نامی انصاری کو لے کر سہائی جگدمبا سہائے اسکول جہاں وہ مشاعرہ ہو رہا تھا گیا۔ وہاں گیٹ پر چند آدمی پہرہ دے رہے تھے جو کسی کو دعوت نامہ دیکھے بغیر اندر جانے نہ دیتے تھے۔ چونکہ میں کوٹ پتلون میں تھا اور شاعر معلوم نہیں ہوتا تھا، میں نے گیٹ کی جانب جانا مناسب نہ جانا۔ نامی انصاری کی شیروانی اور ان کا چشمہ دونوں ان کے شاعر ہونے کی غمازی کر رہے تھے موقع پر کام آ گئے۔ نامی آگے بڑھے پہرہ داروں نے روکا۔ نامی نے "میں غزل پڑھنے آیا ہوں" کہہ کر قدم آگے

بڑھایا۔ لوگوں نے کچھ پیش و پیش کے بعد ان کو اندر جانے دیا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے مجاز چچا کو منتظر پایا۔ کیونکہ ان کے ہمراہ لکھنؤ سے مجروح سلطان پوری اور منظر سلیم بھی آئے تھے جو انجمن کے مشاعرہ ہال میں پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ مجاز چچا نے کئی بار ان دونوں کے متعلق ان لوگوں سے دریافت کیا۔ کبھی انھوں نے "کھانا کھا رہے ہیں" کہہ کر ٹال دیا اور کبھی کچھ — نامی نے واپس پہنچ کر مجاز چچا کو سب حالات بتائے۔ پہلے تو وہ گھبرائے اور یہ سمجھے کہ یہ شخص کہیں فراڈ نہ کر رہا ہو۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ ترقی پسندوں کا مشاعرہ نہیں ہے۔ نامی نے بتلایا نہیں وہ تو حلیم کالج میں ہو رہا ہے۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا یہ حلیم کالج نہیں ہے۔ ان کو جب بتلایا تو وہ فوراً "چلو، بھاگو، بھاگو" کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی سے نامی کے ساتھ گیٹ کی جانب جانے لگے۔ کچھ لوگوں نے مجاز چچا کو روکا۔ وہ "ابھی آ رہا ہوں" کہہ کر باہر نکل آئے۔ اسی وقت انجمن کے سکریٹری نصیر ایک کار لے کر وہاں پہنچ گئے اور ہم ان کو اپنے مشاعرہ میں لے آئے۔ کچھ دیر بعد اس مشاعرہ کے صرف سامعین ہی نہیں بلکہ "شعرائے کرام" بھی مشاعرہ میں جلوہ گر نظر آئے۔ انجمن کے مشاعرہ کو ناکامیاب بنانے والوں کا اپنا مشاعرہ ناکامیاب ہو گیا۔

مجاز چچا میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں یہ خوبی بھی تھی کہ انھوں نے کبھی کسی کی غیبت اور برائی نہیں کی نہ ریاکاری سے کام لیا۔ اگر کسی کے متعلق کچھ کہا تو اس کے سامنے اور اس طرح کہ اس کو برا نہ لگے۔ وہ مذاق ہی مذاق میں تلخ سے تلخ بات کہہ جاتے تھے مگر کیا مجال کہ کسی کو بری لگی ہو۔ ان میں ایک خاص بات تھی کہ وہ کسی کو کوئی تکلیف اپنی ذات سے نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ میری سب سے بڑی کمزوری سگرٹ ہے۔ مگر میں ان کے سامنے سگرٹ نوشی سے گریز کرتا تھا۔ وہ چچا جو ٹھہرے۔ انھوں نے بھانپ لیا مجھ سے پوچھا۔ "اختر تم سگرٹ نہیں پیتے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "چچا آپ کے سامنے کیسے پیوں؟" انھوں نے فوراً جیب سے سگرٹ نکال کر دیا —— "لو پیو۔ مجھ سے چچا بھتیجے والی مت کیا کرو۔ تم بھی شاعر ہو اور میں بھی۔ سب برابر ہیں۔ یہ چچا اور بھتیجہ اور کیا؟" ان کی فطرت میں رواداری کا عنصر غالب تھا۔ اکثر ایسے مواقع آئے کہ جب مجاز چچا سے کسی نے کوئی نظم سنانے کی فرمائش اپنے لب و لہجہ میں کی انھوں نے اسے خوش کرنے کی خاطر اسی طرح نظم پڑھی۔ مثلاً ایک بار یہی تھا کسی مزدور نے فرمائش کی کہ آپ وہ نظم سنائیے جس کا شعر ہے:— ؎

"رہبری جالو رہی" "پیغمبری جالو رہی"
"دین کے پردے میں جنگِ زرگری جالو رہی"

انھوں نے ہنس کر اسی طرح "جاری رہی" کے بجائے "جالو رہی" پڑھ کر اس کا دل رکھ لیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ اور ہے کہ جب مزدوروں کے ایک جلسہ میں کچھ مزدوروں نے ان سے درخواست کی کہ وہ "لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں" والی نظم سنائیں۔ انھوں نے مزدوروں کو خوش کرنے کے لئے "آج" کے بجائے "لال" پڑھ دیا۔

مجاز چچا پر ایڈتھ اسٹول کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ "ایک بڑا شاعر بہرحال ایک روایت پرست بھی ہوتا ہے"۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک نظم ان کو سنائی جس میں ساقی سے خطاب کیا تھا۔ ایک شعر تھا ؎

ترے خیال میں یہ وقت گر شراب کا ہے،
تو پھر وجود ترا وجہِ ننگ ہے ساقی!

ایسی روایت جس کا تصور حسین اور کیف آور ہو لیکن بعید از فہم نہ ہو، مجاز چچا کبھی ختم کرنا نہ چاہتے تھے۔

مجاز چچا بلا کے سخن فہم تو تھے ہی اس کے ساتھ وہ جوہر شناس بھی تھے۔ وہ نئے شاعروں کی جن میں ذرا بھی صلاحیت پاتے تھے ہمت افزائی کرتے تھے۔ انھوں نے بارہا نئے شاعروں کی تعریف کی۔ جب کبھی میں نے کوئی غزل یا نظم کہی ان کو بغیر سنائے نہ رہا۔ میں پہلے غزل ہی کہتا تھا۔ مجھ سے نظمیں کہلوانے والے مجاز چچا ہی ہیں جنھوں نے مجھ سے بار بار کہا۔ "اختر میں تم سے خفا ہو جاؤں گا تم غزل بہت کہتے ہو اور نظم بالکل نہیں۔" بھلا مجھ میں یہ مجال کہاں تھی کہ اپنے اتنے اچھے چچا کو خفا کرتا۔ اور اپنے لئے راہیں مسدود کر لیتا۔ میں نے نظمیں کہنا شروع کیں۔ انھوں نے سنیں اور اپنی وسیع النظری کا ثبوت دے کر میری حوصلہ افزائی کی۔ اکثر انھوں نے مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا

جو ہمیشہ قابلِ قبول ہوتے تھے۔ میری ایک غزل کا شعر تھا:-

انھیں بھی غمِ عشق یارب عطا کر،
جو ہنس ہنس کے تردید فرما رہے ہیں!

مجاز چچا نے سُنا۔ "تردید" کو "تنقید" سے بدل دینے کی رائے دی۔ جس سے شعر معنوی اعتبار سے کچھ اور بلند ہوگیا
اسی طرح ایک شعر تھا:-

تری نظر کے، ترے انتظار کے صدقے،
مجھی کو اک دلِ درد آزما دیا تو نے!

اُنھیں جب سُنایا تو اُنھوں نے "آزما" کو "آشنا" سے بدلوا کر شعر کو حسین تر کر دیا۔
مجاز چچا میں شراب پینے کا عیب تھا جس کا اعتراف انھوں نے خود کیا ہے ؎

عیب جو حافظ و خیام میں تھا ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں!

لیکن شرابی ہونے کی تمام تر ذمہ داری ان پر نہیں پڑتی بلکہ ان کے نام نہاد ساتھیوں پر وہ خود تو زمانہ کی ناقدری اور اپنی حسین تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا نہ پاکر شراب سے دل بہلاتے تھے۔ مگر ان کے ساتھیوں نے ان کی باغ و بہار گفتگو سے محظوظ ہونے کی خاطر ان کو شراب پلا پلا کر برباد کر دیا۔ کچھ مجاز چچا نے شراب پی اور کچھ شراب نے مجاز چچا کو پی لیا۔ چند ماہ پیشتر میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا یہ شعر ؎

تلخیِ مے علاجِ غم ہے، مگر
ہائے وہ جس کو مے نہ راس آئی

انھوں نے بہت پسند کیا۔ مگر کیا معلوم تھا آج یہ شعر ان پر صادق آجائے گا۔
ایک طرف مجاز چچا کو چند حاسدوں اور مفسدوں نے بدنام کرنے کی کوشش کی، ان کو پاگل، آوارہ، شرابی جیسے خطابات سے نوازا تو دوسری طرف ان کے اعزا اور احباب نے ان کی حالت پر تاسف کا اظہار کیا۔ مگر نہ اُنھوں نے ان کو بُرا کہا اور نہ ان سے ایکھ صفائی پیش کی۔ انھوں نے خود بارہا اپنے اشعار میں اپنے متعلق کہا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مری بربادیوں کا ہمنشینو، تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے!
روئیں نہ ابھی اہلِ نظر حال پہ میرے ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ،
"آوارہ" و "مجنوں" ہی پہ موقوف نہیں ہے ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ!
بایں رندی مجاز اک شاعرِ مزدور و دہقاں ہے اگر شہروں میں وہ بدنام ہے، بدنام رہنے دے

مجاز چچا نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ اُنھیں اگر شکایت تھی تو ؎

زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے قوانینِ کہن، آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے!

مجاز چچا کو پہلی بار میں نے مرحوم گنگا دھر ناتھ فرحت کے مکان پر شراب پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ قریب گیارہ بجے رات کو وہ ہماری انجمن کے سکریٹری نصیر سے گفتگو کر رہے تھے اس وقت میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنے مخصوص موڈ میں تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگ اُن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں بوتل تھی اور دوسرے میں گلاس۔ میں یہ دیکھ کر جھجکا اور واپس جانے کا قصد کر رہا تھا کہ کہیں میری موجودگی سے مجاز چچا کی دلچسپیوں میں خلل نہ پڑے۔ مگر اُنھوں نے مجھ کو دیکھ لیا اور اپنے قریب بلا کر بٹھاتے ہوئے کہا:-
"میرے بھتیجے صاحب مجھے معاف کرنا .... مگر آج تم مجاز سے مل لو۔ اب تک تم اسرار الحق اور اپنے چچا سے ملے ہو"
اور پھر کہا ــــــ "یہ بات میں اس سے قبل لاہور میں کہہ چکا ہوں" انھوں نے بتلایا کہ راولپنڈی کے ایک مشاعرے میں وہ

اور عدم موجود تھے اتفاق کی بات کہ عدم بغیر پئے اور مجاز چچا بھی۔ عدم کو تعجب کہ کیا مجاز نے چھوڑ دی اور ان کو حیرت کہ عدم اتنا بدنام پینے پلانے والا ہے کیا اس نے توبہ کرلی! دوسرے دن بھی ایک دوسرے مشاعرے میں ان دونوں کا یہی عالم رہا۔ ایک دوسرے کو تعجب کی نظروں سے دیکھتے تھے مگر اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے۔ آخر تیسرے روز وہ دونوں لاہور آئے۔ مجاز چچا جہاں ٹھہرے تھے وہاں شراب کا انتظام پہلے ہی سے تھا۔ بس پھر کو وہ گلاس میں انڈیل کر پینے ہی والے تھے کہ عدم پہنچ گئے۔ مجاز چچا نے عدم کو دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ "آؤ بھائی اب تک اسرار الحق کی ملاقات عبدالحمید سے ہوتی رہی۔ اب مجاز اور عدم کی ہو جائے۔" اس کے بعد دونوں نے پھر خوب جام چھلکائے اور لنڈھائے۔

مجاز چچا نے اپنی شوخی، ذہانت اور بذلہ سنجی کے باعث لوگوں کے دلوں پر رنگ جمایا تھا۔ ان کی نظموں اور غزلوں کے ساتھ ان کے چٹکلے اور دلچسپ جملے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یوں تو ان کے بے شمار لطیفے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مگر میں صرف ان کا ذکر کروں گا جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ واقعات یا تو میرے سامنے ہوئے ہیں یا خود مجاز چچا نے بیان کئے ہیں۔

گنگا دھر ناتھ فرحت ایک ٹی پارٹی کے موقع پر مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ کیا ترقی پسند لوگ بھی چائے پیتے ہیں؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہی سوال انھوں نے پھر دہرایا۔ اب کی میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ مجاز چچا نے بے ساختہ کہا:۔ "یہ لوگ کیا جانیں ابھی یہ ترقی پسندی میں نو مسلم ہیں"

ایک بار مجاز چچا میرے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ایک دوست اپنا قلمی دیوان بغل میں دبائے آپہنچے۔ کچھ دیر کے بعد انھوں نے اپنا دیوان مجاز چچا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجاز صاحب میں اپنی کتاب چھپوانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا آپ اس پر مقدمہ لکھ دیجئے۔" بجائے اس کے کہ وہ ہاں یا نہیں کوئی جواب دیتے مجھے مخاطب کر کے کہا ——— "میر اتنا پرانا شاعر تھا لیکن جو کچھ کہہ گیا ہے آج بھی صادق آتا ہے خوب کہا ہے اُس نے ؎

لے کے دیواں بغل میں اپنا میر
ہم بگاڑے ہیں کام شاعر کا!

اور فوراً ہی مثال دی۔ کہتے نہیں ہیں کہ، چارپائی بچھالو" بے چارے مقدمہ لکھوانے والے بہت شرمندہ ہوئے اور خاموش ہو گئے۔

مجاز چچا کے انتقال سے دو روز قبل عصمت چغتائی نے ان سے کہا "شاہد لطیف نے لکھنؤ سے چکن کے دو تھان منگائے ہیں اور تمھیں بلایا ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "یہ کیوں نہیں کہتیں کہ گڑیاں اور چاک گریباں دونوں ساتھ منگائے ہیں۔"

اگر مجاز چچا اپنے لطیفوں سے لوگوں کو محظوظ کرتے تھے تو وہ دوسروں کی بذلہ سنجی کی داد بھی دیتے تھے۔ اکثر وہ ایسے وہ واقعات جو ان سے وابستہ ہوتے تھے لطف لے لے کر سنایا کرتے تھے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس کا انھوں نے اپنے ساتھیوں میں خوب چرچا کیا۔ کافی عرصہ ہوا ریڈیو اسٹیشن کے ایک مشاعرہ میں اناؤنسر نے کہا کہ اب آپ حضرت مجاز لکھنوی سے ان کا کلام سنئے۔ گھر میں سب لوگ مشاعرہ سن رہے تھے۔ مجاز چچا کی والدہ بھی ریڈیو کے قریب بیٹھی تھیں۔ انھوں نے جب حضرت کا لفظ سنا تو کہنے لگیں۔ "اب کا پوچھے کو موا بہت بڑھا ہے حجرت ہو گوا" (اب کیا پوچھنا۔ موا بہت بڑھا ہے حضرت ہو گیا۔)

مجاز چچا کی بذلہ سنجی ان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی۔ ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے لوگ مجاز چچا کو ایک پیالہ شراب دے کر خریدتے تھے اور ان کو تمام رات گھیرے رہتے تھے جس سے ان کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ موت بھی ان کی انھیں حالات میں ہوئی۔ شراب خانے میں تین بجے رات تک لوگ ان کو گھیرے رہے اور پھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش ان کی طبیعت میں اتنی گرمی اور لچک نہ ہوتی۔ وہ ہر شخص کو خوش کرنے کے لئے لوگوں کے ہاتھوں اس طرح کھیلے نہ جاتے۔ گاندھی جی کی موت پر جارج برنارڈ شا نے کہا تھا (آج یہی الفاظ میں مجاز چچا کے لئے کہے بغیر نہیں رہ سکتا!)

مجاز — کچھ اور بھی تھا

نئی دہلی
۳۔۱۰۔۵۶

محترمی فکر صاحب! سلام و خلوص۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی غیر ادبی مصروفیتوں کی وجہ سے مجاز صاحب پر کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔ بہرکیف میں مجاز صاحب کی شخصیت کے صرف ایک پہلو پر چند باتیں لکھ کر بھیج رہا ہوں۔

میں نے پہلی بار مجاز صاحب کو ۱۹۳۶ء میں پٹنہ کالج کے بزم ادب کے سالانہ مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ میں ان دنوں اسکول کا طالب علم تھا۔ نہ شاعری کا مطالعہ تھا اور نہ اس کی سمجھ تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ان کے اشعار یاد ہوتے گئے۔ اور ان میں ایک عجیب سی کشش کا احساس ہوا۔ چنانچہ جب وہ مشاعرے میں اپنا کلام پڑھنے لگے۔ تو میں تمام حاضرین کی طرح بڑے احترام اور اشتیاق سے کلام سنتا اور بری طرح متاثر ہوتا رہا۔

میری ان سے پہلی بار جنوری ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ کی نمائش کے مشاعرے کے دوران میں ایک چائے خانے میں ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا تو اس مجاز میں جسے میں نے ۱۹۳۶ء میں دیکھا تھا۔ اور اس مجاز میں جسے ۱۹۵۳ء میں دیکھ رہا تھا۔ بہت نمایاں فرق تھا۔ ظاہر ہے اس طویل عرصے میں ان کے ساتھ کیا کچھ نہ ہو چکا تھا۔ وہ خلاف توقع اور خلاف روایت بہت سنجیدہ تھے۔ اور جب تک ہم لوگ وہاں بیٹھے رہے وہ تقریباً خاموش رہے اور کوئی ایسا جملہ نہ کہا جسے اُن کی شخصیت کا لازمی جزو بنا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے جیسے جیسے میں اُن سے قریب آتا گیا، مجھے ایک بات کا احساس بری طرح ہونے لگا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ شراب کے عاشق زار تھے، بڑے نازک اور خوبصورت جملے کہتے تھے، دوست پرست تھے، دیوانے بازار تھے۔ لیکن غالباً یہ سب پہلو ان کی شخصیت کے سب سے اہم پہلو نہیں تھے۔ انھیں لوگوں نے نہ جانے کیوں ایک نارمل آدمی کی طرح دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ زندگی کے تمام مسائل پر بھی سوچتے تھے اور ایک حقیقت پسند کی طرح۔

ایک بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ شاید عام لوگوں کے لئے تعجب خیز ہو۔ وہ زمانہ طالب علمی میں بہت اچھے اسپورٹس مین تھے۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اور چونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں بھی ٹینس اور ہاکی وغیرہ کھیلا کرتا تھا۔ اس لئے مجھ سے کہا کرتے تھے کہ انھوں نے غوث محمد کے ساتھ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی کی ٹینس کی ڈبل چیمپین شپ جیتی تھی۔ غوث محمد سے بڑا ہندوستان نے ابتک ٹینس کا کھلاڑی پیدا نہیں کیا ہے۔ مجاز صاحب کی دلچسپی ابتک ٹینس سے قائم تھی۔ اور وہ آج کل کے سب ہی اچھے کھلاڑیوں کو نام سے جانتے تھے۔ اور ان کے کھیل کے محاسن اور معائب پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔[1]

غرضکہ وہ محض ایک شرابی شاعر نہیں بڑا انسان۔ ایک پرخلوص دوست، مگر مختلف النوع دلچسپیوں کا مالک تھا۔ اس کی ان دلچسپیوں پر کسی نے گہری توجہ نہیں کی۔

تمھارا:۔
حسن نعیم

---

[1] یہ بات شاید بہت کم ادیبوں کو معلوم ہوگی کہ سردار جعفری، مجاز لکھنوی سے پہلی بار ٹینس کے میدان ہی میں ملے تھے (ح ۔ ن)

مستقل عنوان

ہمارا خیال ہے

گزشتہ ماہ کے "شاہراہ" میں ہم نے ایک دلچسپ اضافہ کا اعلان کیا تھا۔ اور شاہراہ کے مداحوں اور قارئین کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ اگر آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے کسی بھی ادبی رسالہ میں ایسی کہانی، نظم، ڈرامہ یا مضمون پڑھا ہے جس کے متعلق آپ اپنی کوئی اچھی یا بُری رائے رکھتے ہیں، اگر آپ کسی بھی ادبی مسئلہ یا ادبی اور تہذیبی حلقوں کے سامنے اپنا کوئی نقطہ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں ___ تو آپ اسے لکھ کر ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم اسے اس عنوان کے تحت ہر ماہ شائع کیا کریں گے تا کہ قارئین اور فنکاروں میں ایک ذہنی اور تہذیبی تال میل پیدا ہو سکے ___ چنانچہ زیر نظر شمارہ ___ سے ہم اس سلسلہ کا آغاز کر رہے ہیں اور چند موصول شدہ چیزیں پیش کر رہے ہیں۔

کیا تمام فن پراپگنڈہ ہے؟

اکتوبر ۱۹۵۵ء کے شاہراہ میں بی۔ آر۔ ساہنی کا مضمون "فن اور پروپیگنڈا" پڑھا۔ اب تک فن (ادب) کے متعلق دو نظریے تھے۔ ۱۔ ادب برائے ادب۔ ۲۔ ادب برائے حیات جناب موصوف نے ایک نیا نظریہ نکالا ہے "تمام فن پروپیگنڈا ہے مگر تمام پروپیگنڈا فن نہیں"۔ اس کی توضیح نہیں کی گئی کہ یہ نظریہ کب وجود میں آیا اور کس کے ذہن کی پیداوار ہے۔ بظاہر خود جناب ساہنی نے وضع کیا ہے۔ انہوں نے فن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "اپنے وقت کی سماجی زندگی سے متعلق کسی فرد کے احساسات کے شعوری طور پر خوبصورت ڈھنگ سے اظہار کو فن کہا جا سکتا ہے" گویا یہ غلط ہے کہ اپنے وقت کی قید نے پیشروؤں کے تمام کارناموں کو دائرۂ فن سے خارج کر کے شاعری کے عمل کو ایک تنگ حلقے میں محصور کر دیا۔ اگر ادب برائے پروپیگنڈا ہے اور پراپگنڈا بھی ایک خاص جماعت کے معتقدات کا عام، خلاقی یا تمدنی اقدار کا نہیں تو دنیا کا بہترین ادب ناقابل اعتنا ہو جائے گا۔ ہومر نے جو واقعات بیان کئے وہ اس سے دو سو برس پیشتر کے ہیں، ماہی نہیں بلکہ ان کا معقول حصہ اس کے تخیل یا مذہبی عقائد کا آفریدہ ہے۔ یہی حال کم و بیش کالیداس کی شکنتلا، فردوسی کے شاہنامہ، ڈانٹے کی کامیڈیا، شیکسپیر کے متعدد ڈراموں اور نظموں کا، ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ، انیس کے مراثی اور دیگر تصانیف کا ہے جنہیں دنیائے ادب کا لافانی ذخیرہ کہنا چاہیئے۔ ان میں کسی سماجی تحریک کا پرچار نہیں جو پروپیگنڈا کا مقصد ہے۔ اور ساہنی صاحب کے بموجب جو پروپیگنڈا نہیں وہ فن نہیں! دور کیوں جایئے علی سردار جعفری کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" لیجئے جسے میں ترقی پسند برادری کا ممبر نہ ہوتے ہوئے بھی اردو کے دورِ جدید کا بہترین شاہکار سمجھتا ہوں۔ گو اس کا بنیادی خیال انگریزی سامراج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔ اس کے متعدد مقامات منظر کشی اور جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں جنہیں براہ راست پروپیگنڈا سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر ساہنی صاحب کی منطق کو صحیح مان لیا جائے تو وہ سب ناقابل اعتنا ہیں کیونکہ ان میں

پروپیگنڈائی نعرے بازی نہیں ہے۔ مگر جن کی ادبی رعنائیاں اور دل آویزیاں جب تک اردو زبان باقی ہے پڑھنے والوں کو مسحور کرتی
رہیں گی۔ فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے بہترین شاعر سمجھے جاتے ہیں اور بجا طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ کیا اُن کی اشاراتی شاعری میں
پراپیگنڈا کی وہی اہمیت ہے جو شاعرانہ صناعت اور کلبرگی سے نازک حساس دل کے جذبات کی بے ساختہ اور شبنم آلود معصومی کی
ہے۔ وہ شاید فطرت کی نقاب کشائی ہے یا پراپیگنڈا ہے۔ فیض نے قدما سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔ یہاں تک کہ "دست صبا"
کی ایک غزل کو زندہ سوز، دمرزا رفیع سودا، کیا ہے۔ ترقی پسندوں کے روح رواں سجاد ظہیر جن پر اُردو ادب ہمیشہ ناز کرے گا۔ اور
جن کی بالغ نظری ناقابل انکار ہے ابتدا سے زور دیتے رہے ہیں کہ قدما کو پس پشت نہ ڈالو۔ اُن کا کلام بغور پڑھو اور اُن کے خیالات
و اسالیب بیان سے واقفیت حاصل کرو۔ یہ پراپیگنڈا سے الگ فن کی اہمیت تسلیم کرنا نہیں ہے تو کیا ہے۔

ساحر صاحب نے یہ فقرہ اپنے مضمون میں ایک جگہ سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ فن کا اظہار ..... سماجی طور پر تسلیم شدہ سمبل
میں کیا جاتا ہے "۔ یہ فقرہ شرح کا محتاج ہے مگر اس سے تو یہی نہیں کہ سماج سکڑ کر ایک خاص فرقے کا نام رہ جاتا ہے۔ بلکہ شاعروں کی انفرادیت
ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہر شاعر مجبور ہو جاتا ہے کہ سماجی طور پر تسلیم شدہ سمبل کے علاوہ اور کوئی سمبل استعمال نہ کرے۔

جہاں تک اُن کے نظریہ کے دوسرے حصے کا تعلق ہے کہ ہر پراپیگنڈا فن نہیں ہے۔ اس سے کسی ذی ہوش کو انکار نہیں ہو سکتا
مجھے عام ترقی پسندوں سے یہی شکایت ہے کہ محض پراپیگنڈائی نعروں اور بکار کو شاعری سمجھتے ہیں یا پھر ان کی شاعری میں اغلاق و
ابہام اور بظاہر بھاری کم کم بے معنی فقروں کی بھرمار ہوتی ہے۔

اثر لکھنوی

•

رہبر کا مضمون:- مکرمی فکر صاحب ـــــ شاہراہ کے سالنامہ ۱۹۵۲ء میں ہنسراج رہبر صاحب کا مضمون "جوش کی شاعری
اور انقلاب" پڑھا۔ سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" ابھی تک نہیں پڑھ سکا ہوں۔ اس لئے
اس میں سے جو اقتباسات رہبر نے لئے ہیں اُن سے صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہ جوش کی شاعری کے بارے میں سردار نے
کونسی باتیں کس CONTEXT میں لکھی ہیں۔ مجھے جو بات آپ کو خاص طور سے لکھنا ہے وہ یہ کہ ہٹلر سے خطاب "سلام اے تاجدار
جرمنی اے ہٹلر اعظم" والی نظم جوش کی نہیں ہے۔ وہ نظم ایک نوجوان شاعر حیرت گردھیوری کی ہے۔ جو اس زمانہ میں فیض آباد
کلکٹریٹ میں کلرک تھے۔ اور جن کا انتقال دق کے مرض سے ہوا۔ غالباً ۱۹۴۳ء میں انہوں نے یہ نظم ہٹلر کی طرف سے اسکا جواب
فیض آباد جبیک کالج کے ہال میں مجھے کیفی اعظمی۔ ڈاکٹر سید محمد احمد شہرت (جو اب پاکستان میں ہیں) اور سخاوت علی صاحب وکیل
لکھنو کی موجودگی میں سنائی تھی۔ حیرت صاحب بے چارے مجھ سے کہتے تھے میں نیشنلزم پر ہر ازم کو قربان کر سکتا ہوں۔ جوش نے
کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ نظم میری ہے۔ اور جوش کا انکار کر دینا ہی کافی تھا۔ پھر بھی لوگ اس نظم کو جوش ہی سے منسوب کرتے ہیں۔
اور اس زمانے میں لکھنو کے بہتیرے طلبا کو یہ زبانی یاد تھی۔ جوش ہی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" والی نظم لکھی اور پھر
جب ان کے گھر کی تلاشی ہو رہی تھی اسوقت انہوں نے نظم تلاشی لکھی۔ اور انسپکٹر پولیس کو وہیں سنائی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ نیا ادب
۱۹۴۰ء میں لکھنو میں وہ نہیں چھپ سکی اور وہ صفحہ خالی رہ گیا اس میں نوٹ دے دیا گیا۔ کہ یہاں جوش کی نظم تلاشی چھپ رہی تھی مگر
ضبط ہو گئی۔ اس لئے یہ نہ چھپ سکی۔ اب یہ غلط فہمی دُور ہو جانی چاہیئے۔ آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر جوش نے یہ نظم
لکھی ہوتی تو وہ انکار نہ کرتے۔

کاظم مرزا

•

اصغر گونڈوی پر توجہ دیجئے:- مکرمی سلام مسنون۔ اردو میں ادب با ترقی پسند ادب کے تحت جو نظم و نثر لکھی جا رہی ہیں۔ ان
کا بیشتر حصہ بہت مفید بھی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اب ایک تجربے سے گزر رہے ہیں۔

ابھی تو ادبی سرمائے کے پچاس صفحات بھی ایسے نہیں ہیں جنہیں عظیم ادب کا نام دیا جا سکے۔ اسی طرح ابھی تو ہمارے ادیب اور شاعر بھی تجربگاہ میں ہیں اسلئے ان کے افکار کو کلاسیکی نگاہ سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن قدیم ادب سے استفادے کے لئے جس ریاض کی ضرورت ہے اکثر اوقات عقائد اور عصبیت کے باعث اس سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دور گذشتہ کے ارکان میں اصغر گونڈوی کے ساتھ بھی نئی نسل نے انصاف نہیں کیا حالانکہ اصغر پر توجہ خود انکی تحریریں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ احتشام، سرور، ممتاز حسین اور دیگر مارکسٹ نقاد اصغر اور اس دور کے دوسرے فنکاروں پر اپنے خیالات کا اظہار کریں تاکہ قدیم اور جدید کو تاریخی پس منظر میں دیکھا جا سکے اور انکی قدروں کا اندازہ ہو سکے۔

نیاز مند —— جنید احمد

بھوکا بھگوان:- جنوری کے "شاعر" میں میں نے نینا کاش کا افسانہ "بھوکا بھگوان" پڑھا۔ افسانہ بے حد پسند آیا۔ پڑھ کر بے ساختہ مصنفہ کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ اتنی بڑی فنکار آج تک کہاں روپوش تھیں؟ یہ افسانہ کتنا دلچسپ ہے اور کسقدر حقیقت پر مبنی ہے۔ آج کی زندگی کی عکاسی کس نرالے انداز اور کس دلچسپ پیرایہ میں کرتا ہے۔ کتنا خوبصورت خیال ہے۔ یہ عظیم تخلیق اپنے ماحول کا نہایت ہی گہرا اثر لے کر آئی ہے —— انسان تو بھلا انسان ہے حقیقت یہ ہے کہ بھگوان پر بھی ماحول کا ظلم ہوتا ہے۔ یہ ظلم شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر، بہرحال یہ ظلم ہوتا ہے کہ اسکی یعنی بیچارے بھگوان کی نفسیات کو سمجھے بوجھے بغیر اس کے متعلق رائے قائم کر لی جاتی ہے اور اسے سزا ملتی ہے جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ نینا کاش نے ماحول کی نفسیات پر تنقید کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا ہے اور بھگوان کی نفسیات کے ساتھ ہمدردی دکھائی ہے۔

اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو اس افسانہ میں مندرجہ ذیل چیزیں نظر آئیں گی۔ ایک خاص قسم کی محبت کی جھلک، مظالم سے مقابلہ کرنے کی للکار اور غریب انسانوں کی معصوم فطرت، یہ کہانی سماجی زندگی پر طنز ہے۔ وہ طنز جسمیں تیزی ہے اور جو نشتر کا کام کرتی ہے یہاں سماج کی نفسیات کا نہایت ہی فنکارانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ آج کے ماحول کی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس افسانے میں گندے اور تاریک گوشوں پر تنقید ہے۔ اس طرح طنز اور تنقید سے اس کہانی میں ایک ستھرا راستہ بھی پیدا ہوتا ہے جس رستے پر نشیب و فراز نہیں ہیں۔ اس طرح نینا کاش رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ اس لئے یہ افسانہ اور زیادہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا عنوان اتنا جاذب نظر اور دلکش ہے کہ عنوان دیکھتے ہی دل خواہ مخواہ افسانہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے اور پڑھنے کے لئے تڑپ اٹھتا ہے

سچ سچ انسان بھگوان کو بھول گیا ہے اور دھن کو بھگوان سمجھ بیٹھا ہے جو دھن وان ہیں۔ جن کے پاس دولت نہیں ہے وہ انسان نہیں ہیں۔ حیوان سے بدتر ہیں اور کتے کی زندگی گذارنے پر مجبور محض ہیں۔

عاصی

مجاز کی آخری غزل:- محترمی! سلام و نیاز —— میں آپ کی توجہ روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ کے سنڈے ایڈیشن "اجالا" یکم جنوری ۱۹۵۶ء کیطرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسمیں مذکورہ بالا عنوان کے تحت مرحوم کی ایک پرانی غزل شایع ہوئی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

محبت کا ہر بھید پایا بھی ہے — مگر اپنا دامن بچایا بھی ہے

التماس عرض ہے کہ یہ غزل [illegible] کی ہے اور "آہنگ" میں موجود ہے۔ اسکے علاوہ سنہ ۵۲ء تک کے کلام بھی آہنگ میں ہیں تو پھر یہ آخری غزل کسطرح ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے آخری بار کسی جلسہ میں یہ غزل پڑھی ہوگی۔ لہذا اسکی تردید ضروری ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ مجاز مرحوم نے موت سے چند روز پہلے کوئی نئی غزل کہی ہو جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکی۔

انجم باردی

پرچھائیاں

پرچھائیاں — ہندوستان کے مقبول ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی کی ایک تازہ ترین طویل نظم ہے جو کتابی شکل میں "رائٹرز پبلشنگ ہاؤس، بمبئی نے حال ہی میں شائع کی ہے کتاب ۲۲×۱۸ کے چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کئی صفحات مصوّر ہیں، جو ملک کے ہونہار آرٹسٹ ہرکشن کے موئے قلم کا نتیجہ ہیں۔ کتابت، طباعت، اور آرائش کے اعتبار سے کتاب اپنے منفرد حسن کی حامل ہے۔

ادبی حلقوں میں یہ مبہم سا خدشہ، سرگوشیوں کے روپ میں ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ساحر کو فلمی صنعت چھین کر لے گئی۔ اور اب "تلخیاں" کا شاعر شاید اب ہمیں اپنے وہ البیلے نغمے نہیں سنا سکیگا۔ جن میں ایک سلگتے ہوئے رومان کی کسک اور ابھرتے ہوئے انقلاب کا پرتو پھیلا ہوا ملتا تھا۔ مگر پرچھائیاں لکھ کر ساحر نے ہمیں پھر چونکا دیا ہے۔ ہمارے خدشوں کے ابہام میں اپنی فن کارانہ شعاعیں جھلکائی ہیں۔ اور جیسے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا ہے۔ "میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں"

پرچھائیاں — ایک طویل نظم کی تکنیک میں لکھی گئی ہے اور اردو کی طویل نظموں میں ایک اچھوتا اور حوصلہ آفریں اضافہ ہے۔ اچھوتا اس اعتبار سے کہ اردو شاعری میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے، جس میں بیک وقت مختصر افسانہ اور سایائی ڈرامہ کا امتزاج ملتا ہے۔ نظم کا موضوع امن عالم ہے۔ جس کے متعلق بزم ادب میں اکثر یہ شکوہ رہا ہے کہ معاملہ کے سپاٹ ہو جانے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ نظم یا تو تقلیدی کلام ہو جاتی ہے یا میکنیکل اور یا خالی تخیل کاری۔ مگر ساحر نہایت خوبصورتی سے ان خطروں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بچنے کی وجہ اس ڈرامائی تکنیک اور افسانوی پلاٹ میں پوشیدہ ہے۔ جن کی بنیادوں پر ساحر نے اپنی نظم کی تعمیر کی ہے۔ اس نے ایک کردار لیا ہے، جو سماجی ڈھانچے کی برکتوں کی بدولت عشق ناکام کا سمبل بن چکا ہے۔ اور پھر ایک حسین شب کو وہ محبت کرنے والے سایوں کو ابھرتے ہوا دیکھتا ہے تو اسے اپنے ماضی کی ناساز گار محبت کا پورا پس منظر یاد آ جاتا ہے۔ اور پھر یاد کی ان پرچھائیوں پر تیرتا ہوا وہ جنگ، قحط، آتش و آہن، اور بربریت اور بربادی کی تمام ہولناکیوں کی تصویریں اتارتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ فلیش بیک نظم کے کئی مقامات پر آتا ہے۔ جس سے پوری نظم ایک متحرک ڈرامہ محسوس ہونے لگتی ہے اور اس طرح ساحر ان متحرک لہروں کی بدولت، زندگی کے، سچ اور جھوٹ کے آرٹ کے شاعرانہ فن کے اتنا نزدیک چلا جاتا ہے۔ اتنا گھل مل جاتا ہے کہ وہ میکنیکل اور تقلیدی اور سپاٹ ہونے کے خدشہ کی حدوں سے بہت دور، اپنی ہی ایک تخلیقی دنیا میں نکل جاتا ہے۔

نظم میں وہ مختلف بحریں استعمال کی گئی ہیں، جو مختلف ڈرامائی کیفیتوں کے زیر و بم کو ظاہر بھی کرتی ہیں۔ اور اپنے زیر و بم کے متحرک نقوش بھی بناتی ہیں۔ فنی سطح پر ان نقوش اور ان بحروں کا معنوی اور جذباتی آہنگ بے حد کامیاب ہے۔ نتیجے کے طور پر نظم کا نہایت خوبصورت نفسیاتی ارتقا بھی ہوا ہے اور تاثر بھی آدمی کے ذہن و دل پر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ چھاتا ہے۔ جو نظم کا مقصدی مرتبہ متعین کرتا ہے نظم پڑھتے پڑھتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر ہمیں اپنے جذبات کے پروں پر بٹھا کر بلندی پر لیے جا رہا ہے کہ ہم اس کے نقطۂ عکس تک پہنچے بغیر دم تک نہیں مار سکتے۔ فن کی گرفت اپنے مواد کی سنگینی کے باوجود اپنی نرم اور لطیف شدت قائم رکھتی ہے۔

پرچھائیاں — ہمارے ادب کو نہ صرف تحریک امن کی دین ہے بلکہ تحریک امن کو بھی ایک دین ہے۔

(ادارہ)

ہماری مطبوعات

مکتبۂ شاہراہ اور اس کی مطبوعات کی بیشتر خصوصیات حُسنِ طباعت
کے اعتبار سے روایت ہیں۔ اس کی کتابیں زندگی کے
پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرتی ہیں۔ انسانیت
کے تابناک مستقبل کی جھلک دکھاتی ہیں۔
منزل کو بے نقاب کرتی ہیں اور
زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ کمزور
بیمار اور انحطاط پذیر رجحانات
کا پردہ چاک کرتی ہیں۔

۱۹۵۰ء کا بہترین ادب :- مرتب سردار جعفری اور پرکاش پنڈت
قیمت -/8/5

۱۹۵۱ء کا " " :- مرتبہ سردار جعفری - ممتاز حسین - جگن ناتھ آزاد اور پرکاش پنڈت - قیمت -/8/5

سُرخ آنچل :- تیرہ ممتاز افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا مجموعہ معہ حالات زندگی اور تصاویر - مرتبہ پرکاش پنڈت -
قیمت -/12/3

نقوشِ زنداں :- سجاد ظہیر کے خطوط کا مجموعہ - مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر -
قیمت -/12/3

بھوک :- (دوسرا ایڈیشن) نٹ ہمسن کا نوبل پرائز یافتہ ناول - مترجم محمور جالندھری - قیمت -/8/3

زُلفوں کے سائے میں :- مصنف شہبہ ین - نئی داستان - قیمت -/4/1

ایہہ بھجو کی سچی کہانی :- مصنف لہسون چین کا پریم چند - شاہکار ناول - قیمت -/4/1

آدمی اور سکّے :- مہندر ناتھ نے اس ناول میں آج کی سماج کی بڑی فنکاری کے ساتھ عکاسی کی ہے - اقتصادی اور معاشرتی حالات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے - قیمت -/12/2

میراث :- پرکاش پنڈت - مصنف کو اس کتاب پر انعام مل چکا ہے - یہ موصوف کے افسانوں کا مجموعہ ہے - قیمت -/-/3

پتھر کی دیوار :- سردار جعفری نے جیل کی دیوار سے لے کر کشمیر وادی تک کیا دیکھا - اس پر کیا گذری اور اس نے کیا محسوس کیا - آپ کو اس مجموعہ میں ملے گا - قیمت -/8/2

ایشیا جاگ اُٹھا :- سردار جعفری نے ایشیا کی عظمت اس کے ماضی اور حال نیز درخشندہ مستقبل پر بہترین نظمیں لکھی ہیں - قیمت -/12/-

ستاروں سے ذرّوں تک :- جگناتھ آزاد کی شاعری میں ماضی کی بہترین روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں - قیمت -/12/2

بیکراں :- جگن ناتھ آزاد کے پہلے مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن - قیمت -/8/4

ماں :- میکسم گورکی کا شہرۂ آفاق ناول جواب تک لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکا ہے - اُردو ترجمہ صفحات ۴۷۰ - قیمت -/8/6

چین کی بہترین کہانیاں :- یہ دُنیا کے بہترین افسانوی ادب کی پہلی کڑی ہے - مؤلف و مترجم ظ انصاری صفحات ۱۸۰ - قیمت -/-/2

للکار :- دنیا کے آٹھ باغی شعراء کے کلام معہ سوانح حیات و تصاویر - مترجم نریش کمار شاد - قیمت -/4/2

دیا بُجھ گیا :- کرتار سنگھ دگل کا حب وطن سے لبریز ڈرامہ - جو ایک کشمیری ماں کی اپنی مثال آپ ہے - قیمت -/4/1

ماؤ سی تنگ :- ایشیا کے سب سے بڑے انقلابی ہیرو اور سرخ چین کے رہنما کی زندگی اور مختصر حالات - اکبر تونسوی نے تحریر فرمائے ہیں - تیسرا ایڈیشن - قیمت -/4/1

طوفان کی کلیاں :- پھولوں کے دیس کشمیر کی سماجی گرفت سے متعلق کرشن چندر کا ناول - قیمت -/4/4

میں انتظار کروں گا:- جب سماج افسردگی اور یاسیت کا شکار ہو جاتا ہے جب ماحول پر ادامی کے غمناک بادل مسلط ہو جاتے ہیں تب کرشن چندر ان عکسی کی تصویروں میں رنگ بھرتا ہے۔ قیمت -/2|8

ڈوبتے سائے:- عادل رشید نے اپنے دل کی دھڑکنیں اس روپ میں پیش کی ہیں۔ قیمت -/-/3

تشنگی:- یہ ناول ایک بڑے مقصد اور عظیم تجربہ کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ یہ ایک نہیں ہزاروں پیاسی زندگیوں کی چیخیں اور بلبلاتی ہوئی فریاد ہے۔ رشید اختر ندوی نے یہ ناول شدتِ تاثر کے ساتھ وطن کی روشنی اور دل کی قیادت میں لکھا ہے۔ قیمت [illegible]

سنگ میل:- ایک ستھرے ادبی مذاق کا ثبوت ہے یعقوب عثمانی صاحب کے کلام کو سلجھے ہوئے خیالات اور مخصوص طرزِ ادا نے ایک ممتاز مقام پر پہنچا دیا ہے۔ قیمت مجلد -/۲

مینا بازار:- شہرت یافتہ ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی زندگیوں کے بارے میں منٹو کی کہانیاں حقیقت نگاری کی معراج ہیں۔ قیمت -/6/2

دیگر کتب

ادب

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ	-/-/۱۰
اُردو ہندی ہندوستانی	سجاد ظہیر	-/۱۲/-
ادب اور سماج	احتشام حسین	-/۱۲/۲
ترقی پسند ادب	سردار جعفری	/۴
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۶/۸
بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر عابد حسین	۲/۸
مشترکہ زبان	مہاتما گاندھی	-/۴
ایک مشرقی کتب خانہ	سید مبارز الدین	-/۳
اُردو زبان	علامہ کیفی	-/۴/۱
روحِ تہذیب	سید غلام الدین	-/۱۲/۱
نیرنگ خیال مکمل	محمد حسین آزاد	-/۸/۱

کتاب	مصنف	قیمت
جنوبی ہند میں اردو [illegible]	مجلس [illegible] آزاد	-/۱
صبح ہوتی ہے	کرشن چندر	۲/۴
روسی ادب مکمل	پروفیسر محمد مجیب	-/۴
پرچھائیں	آصف علی بیرسٹر	۴/۸
بعض شعراء کے خطوط	ضیاء الاسلام	۴/۸
ادب اور نفسیات	شکیل الرحمٰن	۲/۱۲
شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں	لطیف اعظمی	-/۳
۱۹۴۵ء کا بہترین ادب	مکتبہ شاہراہ	۵/۸
۱۹۴۶ء " "		۵/۸
ادب اور انقلاب	اختر حسین	۲/۸
منتخب ادب	غلام ربانی تاباں	-/۴
آرائشِ محفل	نول کشور	۱/۸
انشائے داغ	سید علی حسن	۱/۶
باغ و بہار	میر امن دہلوی	۲/۴
الف لیلیٰ مکمل	نول کشور	-/۵
داستان امیر حمزہ	"	-/۵
معرکہ چکبست و شرر	"	-/۳
نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر	۳/۱۲
زیرِ لب	صفیہ اختر	-/۲
دو نایاب زمانہ بیاضیں	ہندوستانی اکیڈمی	۲/۴
ہندی شاعری	اعظم کریوی	-/۳
ہندوستان کا قدیم تمدن	جلال الدین	۱/۸
تاریخ نثریات اُردو	جلال الدین جعفری	۲/۸
تاریخ قصائد اُردو	"	۲/۸
تاریخ ریختی	دیوان جان صاحب	۲/۸
آموزگار پارسی	محمد حسین آزاد	-/۱
قند پارسی	"	-/۱
خزینۃ الامثال	جلال الدین جعفری	۱/۸
فلسفۂ کلام غالب	شوکت سبزواری	۳/۴
ساحل و سمندر	احتشام حسین	۲/۸

غبار خاطر	مولانا ابو الکلام آزاد	۶/-
تاریخ صحافت اردو	امداد صابری	۳/-
یادرفتگاں	جگر بریلوی	۴/-
عود ہندی	غالب	۱/۸
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ		۲/-

تنقید

چند تنقیدات	عبد الحق	-/۸
مطالعے اور جائزے	راجندر ناتھ شیدا	۲/۸
کیفیہ	کیفی دہلوی	۳/
نکات الشعرا	میر تقی میر	۱/۱۲
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	۳/-
اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین	۱۰/-
محاسن کلام غالب	ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری	۱/۴
تنقید جدید	اختر اورینوی	۳/۸
تحقیق و تنقید	"	۳/۸
تحقیقی مقالے	پروفیسر معین الدین	۲/۴
جارج برنارڈ شاہ	ظ۔ انصاری	۳/۸
تحقیقات	ڈاکٹر عندلیب شادانی	۳/۱۲
شاعرات اُردو	محمد جمیل احمد بریلوی	۶/-
اقبال کی شاعری	عبد المالک	۵/۸
مطالعات نیاز	نیاز فتح پوری	۵/-
تنقیدی سرمایہ	پروفیسر عبد الشکور	۲/-
انیس کی مرثیہ نگاری	اثر لکھنوی	۲/-
چھان بین	"	۳/۸
نقدیات	ممتاز حسین	۲/۸
تنقیدی مطالعے	اویس احمد	۳/۸
نصرتی	ڈاکٹر عبد الحق	۳/-
اثر کے تنقیدی مضامین	نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲/۸

شعر العجم مکمل	مولانا شبلی	۱۴/۸

مقالات

مقالات حالی مکمل	عبد الحق	۴/۸
فردوسی پر چار مقالے	پروفیسر محمد شیرانی	۲/۸
مقالات گارساں دتاسی اول	انجمن	۴/-
دوم	"	۴/-
خطبات گارساں دتاسی		۴/-
مقالات اسلم	اسلم جیراجپوری	۲/۸
مضامین عابد	ڈاکٹر عابد حسین	۴/-
غبار خاطر	ابو الکلام آزاد	۶/-

تذکرے و سوانح

ادبی اور قومی تذکرے	پنڈت کشن پرشاد کول	۲/۸
" "	حصہ دوم "	۲/۸
تذکرہ ریختی گویاں	سید فصیح علی حسینی	-/۱۲
دور جدید کے ہندو شعراء	عبد الشکور	۲/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	اشرف صبوحی	۲/۸
چمنستان شعرا	لچھمی نراین	۴/۱۲
گلزار ابراہیم	سید محی الدین	۲/-
ریاض الفصحا	غلام ہمدانی	۲/-
تذکرہ شعرائے اُردو	میر حسن دہلوی	۱/۴
رند پارسا	تذکرہ ریاض خیرآبادی	۲/۴
ذکر غالب	مالک رام	۳/-
حیات سرسید	نور الرحمٰن	۳/۸
پریم چند	ہنس راج رہبر	۳/۱۲

حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	۸/-
خدو خال	فکر تونسوی	۲/۸
حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	۹/-
ٹالسٹائی کی سرگذشت	"	۱/۴
عصمت چغتائی	سعادت حسن منٹو	-/۱۵
دیوندر ستیارتھی ساحر لدھیانوی		/۱۵
اسرار الحق مجاز	عصمت چغتائی	/۱۵
سعادت حسن منٹو	کرشن چندر	/۱۵
وید بدامیری	سید محمد عبدالحکیم	۲/۸
کیا خوب آدمی تھا	ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ	۱/۸
میر تقی میر	خواجہ احمد فاروقی	۱۲/-
کتاب الہند اول	سید اصغر علی	۸/-
" دوم		۳/-
فرنگیوں کا جال	امداد صابری	۵/-
مقدمہ آزاد ہند فوج	"	۴/-
تاریخ کانگریس	ڈاکٹر پٹھابھائی سیتارمیہ	۳/-
ڈگمگاتی دنیا	جواہر لال نہرو	۲/-
جدوجہد	جے پرکاش نرائن	۳/۸
امن کا راستہ	عبدالغفار مدھولوی	۳/-
باپو کے قدموں میں	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۱۵/-
مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۱/۸
ہندوستان کی قدیم درسگاہیں		۱/۴
میری کہانی مکمل	جواہر لال نہرو	۸/-
تلاش حق	مہاتما گاندھی	۸/-
شیر دل	اروناآصف علی	۱/۸
جواہر لال کی کہانی	منشی انتظام اللہ	۵/-
گاندھی جی کی کہانی	"	۵/-
اشوک اعظم	محمد حنیف	۱/۸
ہندوستان اور آزادی	ایمری	۱/۸
لال قلعہ کا تاریخی مقدمہ		۳/۴
سابرمتی کا دیوتا		۲/۸

احمد نگر جیل سے	پٹھابھائی سیتارمیہ	۲/۸
اچاریہ کرپلانی		۱/۱۲
راہ گاندھی	اچاریہ کرپلانی	۲/-

تاریخ اسلام

اسلام میں غلامی کی حقیقت	مولانا سعید احمد	۲/۴
عرب اور اسلام	سید مبارز الدین احمد	۲/۸
مسلمانوں کا عروج و زوال	سعید احمد	۵/-
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت مکمل	"	۱۰/-
مسلمانوں کا نظام مملکت	ڈاکٹر حسن ابراہیم	۵/-
تاریخ اسلام پر ایک نظر مکمل	مولانا عبدالرحمٰن	۶/۸/-
تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی	۱۳/۸/-
قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات		۶/۴/-
غلامانِ اسلام	مولانا سعید احمد	۶/۸/-
اسلام کا اقتصادی نظام	حفظ الرحمٰن	۶/۸/-
اسلام کا نظام مساجد	ظفر الدین	۴/۸/-
تاریخ ملت (مکمل تاریخ اسلام)	۱۰ جلدیں	۳۳/۴/-
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں		۱/۴/-
اسلام کا نظام عفت و عصمت مجلد		۵/-/-
اسلام کا زرعی نظام مجلد		۵/-/-

سفرنامہ ابن بطوطہ		۳/-/-
علمائے حق مکمل		۱۰/۱۲/-
علمائے ہند کا شاندار ماضی		۴/۸/-
رقعات عالمگیر		۲/-/-
مقدمہ رقعات عالمگیر		۴/۸/-
الفاروق	شبلی نعمانی	۶/-/-
تاریخ الامت اول دوم	غلام اسلم جیراج پوری	۵/۸/-

سیاسیات

جدید بین الاقوامی سیاسیات	اسرار احمد آزاد	۸/-/-
شہنشاہیت	مظفر شاہ خاں	۲/-/-
ہمارا راج	مدن موہن گپت	-/۱۰/-
ہندوستانی سماجیات	پروفیسر مظفر حسین	۴/۴/-
ریاست اور انقلاب	لینن	۲/-/-

معاشیات

سرمایہ	ا۔م۔ جوہر	۱/۸/-
کچھ زر کی بابت	ابر سالم	۲/۸/-
ہندوستان میں بیرونی سرمایہ		-/۱۰/-
ہمارے بنک	محمد احمد شیروانی	۱/۱۲/-
ہمارے مزدور	عبد القادر	۱/۹/-
کاروانِ معشیت	نجم الدین خطیب	۶/۸/-
اصول معاشیات	الیاس برنی	-/۸/۴

مکتبۂ شاہراہ دہلی

نفسیات :-

نفسیات اغواہ	ولی الرحمٰن	۱/۱۲/-
آپ کا بچہ	ڈاکٹر موگا	۳/-/-
بچے کی صحت اور نگہداشت		-/۱۲/-

فلسفہ :-

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق	مولانا حفظ الرحمٰن	۴/۸/-
تنقید عقل محض	ڈاکٹر عابد حسین	۶/-/-
مکالمات افلاطون	ظفر حسین	۴/-/-
انواع فلسفہ		۵/۸/-
فلسفۂ تقریر	سخا برطوی	۱/۸/-

سائینس :-

بجلی کے کرشمے	معشوق حسین	۱/۸/-
القمر	راحت حسین	-/۱/-
طبقات الارض	مرزا مہدی	۲/۸/-
رسالۂ نباتات	محمد یوسف	۱/-/-
حیات کیا ہے	عشرت عابدی	۱/۶/-
مکالمات سائینس	نصیر احمد	۱/۸/-
نباتی دباغت	امداد علی	۶/۸/-
معدنی دباغت		۱/۸/-

تعلیم :-

کتاب	مصنف	قیمت
اصول تعلیم	خواجہ غلام السیدین	۴/-
نئی پرانی تعلیم	پروفیسر عبدالغفور	۱/۱۲/-
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳/-/-
کھیل کے ذریعہ تعلیم	عبدالغفار مدھولی	۲/-/-
زندگی کا رخ	پروفیسر سعید انصاری	۲/-/-
فلسفہ تعلیم	خواجہ غلام الحسنین	۱/۱۲/-
جاپان اور اس کا تعلیمی نظم ونسق		۲/۸/-
کتائی دھنائی	تلارام گوڑ	۱/۴/-
کاغذ بنانا	"	-/۸/-
کامیاب مطالعہ	تجمل حسین	-/۱۲/-
تعلیم کے طریقے		۱/۴/-
تعلیم اور دیہات سدھار		۳/۸/-

لغات :-

کتاب	مصنف	قیمت
فیروز اللغات	مولانا فیروزالدین	۱۶/۸/-
لغات فیروزی		۴/۸/-
لغات کشوری مجلد	نول کشور	۸/۸/-
" غیر مجلد	"	۴/-/-
فرہنگ عامرہ	محمد عبداللہ خویشگی	۶/-/-
لغات جدید	ایم سکندر	۵/-/-
کریم اللغات	نول کشور	۲/-/-
مصباح اللغات	(عربی اردو)	۱۵/-/-
بیان اللسان	"	۱۰/-/-
لغات القرآن مکمل		۱۵/-/-
اردو ہندی لغت	انجمن	۲/-/-

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
انارکلی	امتیاز علی تاج	۲/۸/-
پردۂ غفلت	ڈاکٹر عابد حسین	۱/-/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	-/۱۲/-
کھیتی	"	۱/۸/-
ہیروئن کی تلاش	"	۱/۴/-
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	۱/۴/-
کربلا	منشی پریم چند	۲/۸/-
ڈرامہ اکبر	محمد حسین آزاد	۱/۸/-
ٹیگور کے ڈرامے		۲/۴/-
آگرہ بازار	حبیب تنویر	۱/۸/-
شکنتلا	کشن چند زیبا	۱/۴/-
لنگوٹی والا (گوتم بدھ)	"	۱/۸/-
کایا پلٹ (اچھوت ادھار)	"	۱/۸/-
بیوی اور بیسوا	"	۱/۴/-
زخمی پنجاب	"	۲/-/-
گریجویٹ مزدور	"	۱/۸/-
دان ویر کرن	"	۱/۸/-
یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری	۱/۸/-
خوبصورت بلا	"	۱/۸/-
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	"	۴/۸/-
ارادے	نریندر سیٹھ	۲/۸/-
ریڈیو ڈرامے	فضل حق قریشی	۲/-/-

ناول :-

کتاب	مصنف	قیمت
چوگان ہستی اول	پریم چند	۵/۸/-

چوگان ہستی دوم	پریم چند	۵/۸/-
بازار حسن	پریم چند	۴/۸/-
میدان عمل	"	۵/-
گئودان	"	۶/-
پردۂ مجاز	"	۴/-
غبن	"	۵/-
بیوہ	"	۲/۸
خاک و پروانہ	"	۳/۴
روٹھی رانی	"	۲/۸
دودھ کی قیمت	"	۲/۸
جب کھیت جاگے	کرشن چندر	۲/۱۵
اُلٹا درخت	"	۲/۱۲
طوفان	ٹیگور	۳/-
جیون پربھات	"	۳/-
طوفان کی کلیاں	کرشن چندر	۴/۴
چندر ناتھ	سرت چندر چٹرجی	۱/۸
دور ہے منزل تیری	"	۳/۸
گھر کی آگ	"	۲/-
حسرت	"	۲/-
سماج کا ڈر	"	۲/۴
رادھا رانی	بنکم چٹرجی	۱/-
لوک رہسیہ	"	۱/۴
چندر شیکھر	"	۳/-
راج سنگھ	"	۲/۸
اندرا	"	۱/۸
زہر کا پودا	"	۳/-/-
آنند مٹھ	"	۲/۸/-
ضدی	عصمت چغتائی	۲/
آزادی کے بعد	ہاورڈ فاسٹ	۵/۸
تلی	ڈاکٹر ملک راج آنند	۲/۸
پھانسی کے سائے میں	جیولیس فیوچک	۱/۸
زندگی کے سائے	پرل بک	۲/۴
پیاری زمین	"	۲/۴/-
چینی گاؤں	تین چین	۳/۱۲
خوجی	محمد اسلم	۲/۸
باپ اور بیٹے	ترگنیف	۱/۸
تنہائی کا کنواں	ریڈکلف ہال	۱/۸
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۵/-
عذرا	"	۵/-
جویائے حق	عبدالحلیم شرر	۴/-
قیس لبنیٰ	"	۲/۸
بدنام بستی	ترجمہ انتصار حسین	۲/-
چوراہے پر گوری	نکر تو تسوی	۳/۴
فیصلہ کن جنگیں	محمود بنگلوری	۲/۸
چاندنی	رئیس احمد جعفری	۲/۴
دل	"	۲/-
عورت	"	۴/۸
روپ	عادل رشید	۵/-
لرزتے آنسو	"	۳/-
جب محبت جاگتی ہے	"	۴/-
عشق پر زور نہیں	"	۳/۸
میر صاحب	"	۳/۸
بے ننگ و نام	"	۴/-
خانم	عظیم بیگ چغتائی	۴/-
جنت کا بھوت	"	/۱۲
فل بوٹ	"	۱/-/-
کھرپا بہادر	"	۲/۴/-
تصویر	اے۔ آر خاتون	۴/-/-
شمع	"	۶/۸
افشاں	"	۶/۸/-

مکتبہ شاہراہ ۲ دہلی ۶

کتاب	مصنف	قیمت
شمیم	فیاض علی	۲/۸
آنسو	جمنا داس اختر	۲/۱۲
بردہ فروش	"	۱/۱۲
آگ	"	۱/۱۲
پانی	"	۳/۸
کشمیر کی بیٹی	"	۲/۸
چندر کلا	"	۲/-
رادھا الزبتھ	"	۲/
سونا کا چھی	"	۳/۸
چوٹ اول	دت بھارتی	۳/-
" دوم	"	۳/۸
تڑپ		۳/-
دھڑکن	شیام سندر پرویز	۲/۸
دھند	"	۲/-
نور و نار	"	۲/-
جب کشمیر جل رہا تھا	کشمیری لال ذاکر	۲/-
بنت تبسم	شوکت تھانوی	۳/-
مسکراہٹیں	"	۲/۸
انشاء اللہ	"	۲/۱۲
بقراط	"	۲/۴
بیوی	"	۲/۱۲
داستان مجاہد	نسیم حجازی	۴/-
شاہین	"	۴/۸
آخری معرکہ	"	۴/۸
آخری چٹان	"	۴/-
یوسف بن تاشفین	"	۴/-
محمد بن قاسم	"	۵/-
خدا کی واپسی	خلیل الرحمٰن	۳/۸
اندھیرا خواب	حجاب امتیاز علی	۴/-
زردان بہار	اشفاق احمد	۲/-

کتاب	مصنف	قیمت
حسن کی قیمت	انتصار حسین	۱/۸
جہاں آرا بیگم	ظفر قریشی	۲/۸
ماں	گورکی	۲/۸
کڑوی کہانی	"	۲/۸
مالوہ	"	۱/۱۲
عشق جہانگیر	خواجہ محمود شفیع	۳/-
پیر نابالغ	"	۲/-
جہاں آرا بیگم	"	۲/۸
بھینٹ	ڈاکٹر حکمت اللہ	۳/-
ریشمی پتھر	مسعود جاوید	۳/-
عالم امکاں	"	۲/-
رخسانہ	انیس حسن بقائی	۱/۸
نسرین	"	۱/۸
ثروت آرا بیگم	حمیدہ سلطان	۵/۸
سہرن	اظہار اثر	۲/۱۵
تشنگی	رشید اختر ندوی	۳/۸
گل رخ	"	۲/-
ہرجائی	"	۵/-
ساز شکستہ	"	۱/۸
نسرین	"	۴/-
عزیزہ مصر	عبدالحلیم	
دوشیزہ کابل	صادق سردھنوی	۲/۸/-
حور مراقش	"	۴/-
ماہ طلعت	"	۳/-
نقاب پوش پیغمبر	"	۴/-
بہادر دوشیزہ	"	۳/-
خروش انتقام	"	۵/۸
آفتاب عالم مکمل جامع	"	۹/-
شریف مجاہد		۴/-
کی ساحرہ	"	۴/-

مکتبۂ شاہراہ دہلی ۶

نام کتاب	مصنف	قیمت
افریقہ کی دلہن	صادق سردھنوی	۲/۴
شمشیر سوڈان	،،	۲/-
اندلس کے دو چاند	،،	۶/-
عروس بغداد	،،	۲/-
بہادر کرد	،،	۲/۱۲
فتح انطاکیہ		۲/-
فتح ابوذھوک	،،	۳/-
نورالدین زنگی	،،	۲/۸
محبوبہ حلب		۲/۸
یہ زندگی کے میلے	مائل ملیح آبادی	۲/۸
نیا آدمی	،،	۱/۸
آبرو	،،	۱/۸
بازار	،،	۳/۸
ہجرت	،،	۳/۸
کعبہ سے کربلا تک	،،	۳/-
پاسباں	،،	۲/-
گلنار	خان محبوب طرزی	۲/۴
رسی جل گئی	،،	۳/-
دردانہ	،،	۲/-
برق پاش	،،	۲/-
شعلہ	،،	۵/-
شہزادی شب نور	،،	۲/-
رہبر اعظم	،،	۲/۸
دو دیوانے	،،	۲/۸
فولادی پتلے	،،	۱/۸
صبح اندلس	،،	۲/-
ترپائی	،،	۱/۸
زبیدہ	،،	۳/۸
قزلباس	،،	۳/-
سیلاب	،،	۳/-

نام کتاب	مصنف	قیمت
	،،	۲/۴
عالم گم گشتہ	،،	۳/-
لنگڑا جاسوس	تیرتھ رام فیروزپوری	۲/-
کلب نٹ کی واپسی	،،	۳/۸
للتا	،،	۳/۸
وادی خوف	،،	۲/-
اسیر بلا	،،	۳/-
بجرنتا	،،	۲/-
انجام ہوس	،،	۲/-
بڑا بھائی	،،	۵/۴
دست قضا	،،	۳/۸
خنجر بیدار	،،	۲/-
سرائے والی	،،	۳/۸
فرشتہ انتقام	،،	۳/۸
مطلبی دنیا	،،	۲/-
پہلا ہیرا	،،	۳/-
مقدس جوتا	،،	۳/-
نقلی نواب	،،	۳/۸
انصاف	،،	۲/۸
ڈاکٹر فومانچو		۲/۱۲
،، ،، کی واپسی		۲/۱۲
،، ،، کا انجام		۲/۱۲
آرسین لوپن جاسوس	،،	۳/۸
کارنامجات ارسین لوپن		۳/-
کنیز گمردار		۲/-
سیاہ پوش		۲/۸
بھوک	محمود جالندھری	۳/۸
ہند کی راکھ	کشمیری لال	۱/۴
دو ناولٹ	چیخوف	۱/۴
دل ہی تو ہے	ایمیلی زولا	۱/۴

نام کتاب	مصنف	قیمت
پہلی محبت		۱/۴
آدمی کے بیٹے	مہندر ناتھ	۲/۱۲
رات اندھیری ہے	،،	۲/-
سانچ کو آنچ	شوکت تھانوی	۳/۸
چار سو بیس	،،	۳/-
معمہ خاتون	،،	۱/۸
گرگٹ	،،	۱/۸
موتی کاٹے	،،	۱/۸
جوڑ توڑ	،،	۲/-
بھوٹبس	،،	۲/-
سسرال	،،	۲/-
شیطان کی ڈائری	،،	۱/۸
ظالم محبت	حجاب امتیاز علی	۳/-
اندھیرا خواب	،،	۲/۴
طوفان	رئیس احمد جعفری	۳/-
جواری	،،	۲/۸
درد	،،	۲/۸
ٹھوکر	،،	۵/-
ڈوبتے سائے	عادل رشید	۲/-
کرنیں	جمنا داس اختر	۲/-
چھایا	،،	۳/۸
جلن	،،	۲/۸
نجم السحر	نسیم امروہوی	۵/-
نشاط	،،	۲/۴
شوہر کا روگ	،،	۱/۴
آخری کہانی	،،	۲/-
شگفتہ		۲/-
کہکشاں	،،	۵/-
شبنم	،،	۲/۸
طرز زندگی	،،	۲/۸

مکتبہ شاہدرہ دہلی ۶

کتاب	مصنف	قیمت
سپیدہ	نسیم انہونوی	۵/۰
ستارا	"	۱/۴
موت کے بعد	اظہار اختر	۲/۴
سپیرن	"	۲/۱۲
ناگن اول دوم	"	۱/۴
پتھر کی لاش	"	۲/۰
موت سے پہلے	دت بھارتی	۱/۴
سہارا	"	۱/۴
پیاسی آنکھیں	"	۲/۸
ساحل	عشرت رحمانی	۳/۰
پہلی لڑکی	رازداں	۲/-
اک پیار ایک دھوکہ	رام سرن	۲/۸
اندھیرے	اختر عادل روپڑ	۲/-
انجم	قیسی رامپوری	۳/۸
دو شیشے	"	۲/۸
تنویر	"	۲/-
جاوید	"	۳/۸
شکار	"	۲/۸
نیلام	"	۲/-
بازو بند کھل کھل جائے	سلام مچھلی شہری	۱/۸/-
پیار	زکی انور	۲/۸
نمائش	منظر سلیم	۲/۸
آغوش	"	۲/۸
خلش	"	۲/۸
الفا	کوثر چاندپوری	۳/-
ویراں	"	۲/۸
ثریا	فاطمہ جبیں	۳/-
نگار	"	۳/-
ایرانی	"	۳/۰

کتاب	مصنف	قیمت
شاہدہ	فاطمہ جبیں	۳/۰
شکن	جی ایس عالم	۳/-
محبت کی جاتی ہے	"	۳/۸
ایک شعلہ ایک وجود		۲/۸
نشتر	منشی سجاد حسین	۲/۸

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
فردوس خیال	منشی پریم چند	۳/-/۰
خواب و خیال	"	۲/۸
آخری تحفہ	منشی پریم چند	۲/۱۲/۰
زادِ راہ	"	۳/۰/-
واردات	"	۲/۸
سستا ایڈیشن	"	۱/۹/۰
نئے افسانے	کرشن چندر	۳/-
کشمیر کی کہانیاں	[illegible]	۳/۰/-
اجنتا سے آگے	"	۲/۱۲/-
طلسم خیال	"	۲/۸/۰
نئے غلام	"	۲/۱۲/-
ایک روپیہ ایک پھول	"	۲/۱۲/-
یوکلپٹس کی ڈال	"	۲/۱۲
نغمے کی موت	"	۲/۱۱
ہائیڈروجن بم کے بعد	"	۲/۱۲
راز و نیاز	ٹیگور	۰/۱۲/-
بھولا ناتھ	"	۰/۱۲/-
شعلۂ الفت	"	۰/۱۲/۰
سنگ تراش	"	۰/۱۲/-
شعلۂ آب	"	۰/۱۲/-
نجات	"	۰/۱۲/-
آزادی کا دیوتا	"	۰/۱۲/-

مکتبۂ شاہدرہ دہلی

کتاب	مصنف	قیمت
وطن پرست	ٹیگور	۰/۱۲/۰
خونی سماج	"	۰/۱۲/-
شعلۂ اجل	"	۰/۱۲/۰
ماسٹر جی	"	۰/۱۲/۰
گارڈنر	"	۱/۸/۰
راج رشی	"	۲/۸/-
شجر کے سائے تلے	"	۱/۸/-
طوفانی ہوس	"	۲/-/۰
دو سال بعد	بنکم چٹرجی	۲/۸/-
راج سنگھ	"	۲/۸/-
چوٹیں	عصمت چغتائی	۳/۰/-
کلیاں	"	۳/۸/-
چھوئی موئی	"	۳/۱۲/-
دو ملک ایک کہانی	ابراہیم جلیس	۲/۸/۰
جیل کے دن اور جیل کی راتیں	"	۳/۸/-
ذرا ایک منٹ	"	۲/۰/-
پبلک سیفٹی ریزر	"	۳/-
کالا چور	"	۱/۸/-
آزاد غلام	"	۲/۸/-
میں کون ہوں	خواجہ احمد عباس	۳/۲/-
زعفران کے پھول	"	۲/۰/۰
کہتے ہیں جسکو عشق	"	[illegible]
جب بندھن ٹوٹے	تاجور سامری	۳/۰/۰
دھرتی کے تیور	"	۲/۱۲/-
اکیلا	"	۲/۰/-
کنگالی	مہندر ناتھ	۲/۱۲/۰
کوکھ جلی	راجندر سنگھ بیدی	۲/۱۲/-
ہچکیاں	صدیقہ بیگم	۲/۱۲/۰
رقص بسمل	"	۲/۱۲/-

پیاسی جوانی — کوثر چاندپوری — ۳/-

عجیب لڑکی — اوم پرکاش — ۳/-

جوانی کی آگ — اختر بھوپالی — ۲/-

دوشیزہ ماسکو — " — ۲/۸

آشا دیپ بجھے — ناست پرکاش سنگر — ۲/-

نظمیں :-

بانگ درا — اقبال — ۴/۸/-

بال جبریل — " — ۴/۸/-

ضرب کلیم — " — ۳/-

شرح بانگ درا حصہ اول — ۲/۱۲/-

دیوان حالی — حالی — ۱/۱۲/-

مقدمہ شعر و شاعری — " — ۲/۸

مسدس حالی — حالی — -/۱۰/-

دیوان غالب — غالب — ۱/۸/-

مکمل شرح غالب — عبدالباری آسی — ۳/۸

جاوداں — جاں نثار اختر — ۳/۸

رباعیات محروم — محروم — ۳/۱۲

نوائے کارگر — احسان دانش — ۳/۸/-

دیوان ذوق — ذوق — ۲/-/-

انتخاب ذوق و ظفر — کیفی دہلوی — ۲/-/-

نقش فریادی — فیض احمد فیض — ۲/-/-

دست صبا — " — ۲/۴/-

رباعیات آسی — عبدالباری آسی — ۱/۸

" انیس — انیس — ۲/۸

مثنوی میر حسن — میر حسن — ۱/۱۲/-

گلزار نسیم — نسیم — -/۱۲/-

" کلیات — نظیر اکبرآبادی — ۱/-

کلیات نظیر اکبرآبادی — ۱۲/-/-

کمار سمبھو — منور لکھنوی — ۵/-/-

کائنات — " — ۳/-

آخر شب — کیفی اعظمی — ۳/-

سب رنگ — اختر الایمان — ۱/۸/-

شکست زنداں — غلام ربانی تاباں — ۳/-/-

شاہنامہ اسلام (۴ جلد) مکمل — حفیظ جالندھری — ۱۰/-/-

نغمہ زار — " — ۲/۸/-

تلخیاں — ساحر لدھیانوی — ۳/۸

آہٹیں — نریش کمار — ۲/۴

دستک — " — ۲/-

ہفت رنگ — عرش ملسیانی — ۳/-

چنگ و آہنگ — " — ۳/-

کارواں منزل — امن لکھنوی — ۲/۸/-

رقص دوام — صغیر احمد صوفی — ۱/۱۲/-

اس نظم میں — میراجی — ۲/۸

اکبر الہ آبادی — طالب الہ آبادی — ۵/-

منتخب داغ — احسن مارہروی — ۶/-

نقش بہزاد — بہزاد لکھنوی — ۱/۸/-

موج کا ظہور — " — ۱/۸/-

موج نور — " — ۱/۹/-

صبح زنداں — حسن شہیر — ۳/-/-

نظم لطیف — جلال الدین جعفری — ۳/-

اذکار غالب — ڈاکٹر عبدالحکیم — ۸/۸/-

کلیات اقبال — اقبال — ۵/-

ارمغان حجاز — " — ۴/۸

پیام مشرق — ۵/-

سرود و خروش — جوش ملیح آبادی — ۴/-

سموم و صبا — " — ۸/-/-

پتھر کی دیوار — علی سردار جعفری — ۲/۸

خون کی لکیر — " — ۲/۸

امن کا ستارہ — " — ۱/۴

ایشیا جاگ اٹھا — " — -/۱۲/-

جرس — وامق جونپوری — ۳/۸

جنون و ہوش — جوش ملسیانی — ۴/-

صنم و حرم — شکیل بدایونی — ۲/۴

مقامات — احسان دانش — ۴/-

للکار — نریش کمار شاد — ۲/۴/-

قاشیں — " — ۲/-

دام خیال — رضیاء الاسلام — ۲/-

بادبان — کمال احمد صدیقی — ۱/۸

ستاروں سے — جگن ناتھ آزاد

ذروں تک — ۲/۱۲

بیکراں — " — ۴/۸

رباعیات محروم — محروم — ۳/۱۲

نئے ترانے — ۲/۸/-

صبح زنداں — حسن شہیر — ۳/-

میری نظمیں — بلراج کومل — ۳/-

بوستان روس — شفا دہلوی — ۳/-

نئی کتب

ڈوبتے سائے — عادل رشید — ۳/-

تشنگی — رشید اختر ندوی — ۳/۸

دل ہی تو ہے — اکھیلی نرولہ — ۱/۴

پہلی محبت — مخمور جالندھری — ۱/۴

دنیا الٹ — بھبھوت — ۱/۴/-

سندھ کی راکھ — کشمیری لال ذاکر — ۱/۴

مکتبۂ شاہراہ ۱۳ دہلی ع